رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

نگار

قیمت
۸؍

دنگار" لکھنؤ

تصانیف نیاز فتحپوری

"نگار" لکھنؤ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت دو روپیہ (عہ)
علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۳۲-افسانے ۳۳ء تک کے درج ہیں۔ زبان قدرت بیان اعلیٰ تخیل و پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے

قیمت چار روپیہ (للعہ)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ معہ تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ)
علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)
علاوہ محصول

اُردو شاعری

یعنی جنوری ۳۵ء کا نگار جس میں اُردو شاعری کی تاریخ، اس کی عہد بہ عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعراء پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے معہ انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور جس میں سات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں حجم ۲۵۶ صفحات۔ قیمت عہ علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۳۶ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندی شعراء کے کلام کا انتخاب معہ ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اُردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت علاوہ محصول ۸ھ

"نگار" جنوری ۳۷ء

(۱) "ڈرامہ اصحاب کہف" یہ ڈرامہ مصری انشاپرداز توفیق الحکیم کی کتاب "اہل الاکہف" سے ماخوذ و مقتبس ہے اور تنہا یہی ایسی چیز ہے جو آپ کے ذوق انشا تمثیل کو آسودہ کرنے والی ہے۔ اس کے علاوہ (۲) اسکر وائلڈ کے خطوط جو اُسنے سارہ (مشہور ایکٹرس) کو لکھے تھے اور جو دنیائے ادب و انشاء میں خاص مرتبہ کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ وائلڈ اپنے طرز انشاء و ندرت بیان کے لحاظ سے یورپ میں جس مرتبہ کا شخص شمار ہوتا تھا اُسکا اندازہ آپ ان خطوں سے کر سکتے ہیں (۳) "مسئلہ خلافت و امامت" (از: ڈاکٹر خلیل شیعی کے قلم سے) مسئلہ خلافت و امامت لاکھ قدیم و لایحل سہی پھر بھی اس سلسلۂ تحقیق و جستجو میں بعض ایسی باتوں کے نکلنے کا امکان ہے جن سے مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہو سکے چنانچہ اس سلسلہ کا یہ پانچواں مقالہ ہے اسکے بعض عنوان یہ ہیں:- مسئلہ خلافت کے مبادی مقدمات۔ نفس مسئلہ خلافت۔ مسئلہ خلافت کے فروع و جزئیات وغیرہ ——— صفحات ۱۴۴ — قیمت عہ علاوہ محصول

آیندہ ماہ میں مسئلۂ خلافت وامامت پر ایک معرکۃ الآرا مقالہ کا انتظار کیجئے

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہوجاتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (۵ر) ششماہی تین روپیہ (۳ر)
بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (۸ر) سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۳۳ | فہرست مضامین جون سنہ ۳۸ ع | شمارہ ۶

ملاحظات ---------- ۳
دہلی ولکھنؤ اسکول کی شاعری ---------- عبدالمالک آروی ---------- ۹
وفاق ---------- ۳۴
شیخ امام بخش ناسخ ---------- فراق گورکھپوری ---------- ۴۲
سیاسیات یوروپ ---------- ۴۹
مبادیات تنقید ---------- مجنوں گورکھپوری ---------- ۵۷
منظومات ---------- مضطر ایم-اے-شرف زیدی ---------- ۶۳
اسلامی ہند ---------- ۱۷۵
نغمۂ کارواں ---------- ۲۵

اصلی برقی قوام (تمباکوئے خوردنی قیمتی فی تولہ ۱ عہ) جو قطعاً نزلہ نہیں پیدا کرتا۔ شیخ خورشید علی پرفیومر نظیر آباد لکھنؤ کے پتہ سے ملسکتا ہے۔

اِس ماہ کے رسالہ میں

فہرست سے پہلے آپ کو ایک مطبوعہ کارڈ نظر آئے گا۔ براہِ کرم اسے پڑھ لیجئے اور اگر "مجموعۂ استفسار و جواب" کی کوئی جلد درکار ہے تو اس کی خانہ پُری کرکے بیرنگ پوسٹ کر دیجئے۔ ٹکٹ لگانے کی ضرورت نہیں

لیکن اگر آپ کو ضرورت نہیں یا فی الحال آپ کے پاس یہ مجموعہ موجود ہے تو پھر کارڈ کو ضایع کر دیجئے یا آیندہ کسی وقت کے لئے محفوظ رکھئے

"مجموعۂ استفسار و جواب" ایک قسم کی دائرۃ المعارف یا سائکلوپیڈیا ہے جس میں سیکڑوں ایسے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے، جن کا علم ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔ ہر چند یہ سب نگار میں شایع ہو چکے ہیں، لیکن گزشتہ سترہ سال کی جلدوں کو ہر وقت سامنے رکھنا یا وقت ضرورت ان میں کسی مخصوص بحث کو ڈھونڈھ نکالنا آسان کام نہیں، اس لئے یہ تینوں جلدوں کا مجموعہ اپنے پاس رکھئے تاکہ آپ تلاش و جستجو کی زحمت سے بچیں ۔ اگر آپکے پاس تینوں جلدوں کا پورا سٹ موجود نہیں ہے تو اب اسے پورا کر لیجئے

آیندہ جنوری ۳۹ء کا "نگار"

"مصحفی" نمبر ہوگا

اساتذۂ قدیم میں "مصحفی" جس مرتبہ کا شاعر ہوا ہے، اس کا اندازہ یوں نہ کرنا چاہئے کہ میر کے ساتھ ساتھ اس کا نام بھی لیا جاتا ہے بلکہ اس طرح کہ شاعری کی جن جن اصناف میں اس نے اپنا کمال پیش کیا، اُن کو چھونے کی ہمت میر کو بھی نہیں ہوئی

تمام اُردو شعراء میں یہ خصوصیت صرف مصحفی کو حاصل تھی کہ اس نے ہر رنگ کو اختیار کیا اور جس رنگ کو اختیار کیا اسے اپنا بنا لیا۔ خصوصیت کے ساتھ مشکل زمینوں کو مانوس بنا دینا، کہ اس اب میں تو اس کا ہمسر کوئی پیدا ہی نہ ہوا

مصحفی نمبر بہت ضخیم ہوگا اور مومن نمبر کی طرح انتہائی احتیاط کے ساتھ مرتب کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں جن جن عنوانات پر مقالے درکار ہیں ان کی مختصر سی فہرست یہ ہے :۔ (۱) مصحفی کی شاعرانہ خصوصیات۔ (۲) مصحفی تذکرہ نگار کی حیثیت سے۔ (۳) مصحفی اور اسکے ہمعصر اساتذہ (۴) مصحفی اور اسکے تلامذہ (۵) مصحفی کی شاعری پر ماحول کا اثر (۶) مصحفی بہ حیثیت ایک انسان کے۔ (۷) مصحفی ایک نقاد کی حیثیت سے۔ (۸) مصحفی اور مختلف اصناف سخن وغیرہ وغیرہ ۔ ان کے علاوہ آپ اور جو عنوان مناسب سمجھیں اس پر لکھ سکتے ہیں۔ مضمون معہ تصویر زیادہ سے زیادہ اکتوبر ۳۸ء کے آخر تک پہونچ جانا چاہئے ۔

منیجر نگار

ملاحظات

کیا کانگرس واقعی کامل آزادی چاہتی ہے

جو حضرات نگار کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں، انھیں معلوم ہے کہ میں کانگریسی خیال کا آدمی ہوں اور کانگرس ہی کو ملک کا سب سے زیادہ اہم سیاسی ادارہ سمجھتا ہوں، یہاں تک کہ میں نے مسلم لیگ کے وجود کو ہمیشہ بیکار سمجھا اور مسلمانوں کو یہی مشورہ دیا کہ انھیں کانگرس میں شریک ہونا چاہئے۔ لیکن چونکہ تقلید و تتبع میری فطرت کے خلاف ہے، اور بلا تحقیق و جستجو، بلا تفکر و تدبر، ضمیر کے منافی میں کبھی کوئی راہ اختیار نہیں کرتا، اس لئے کانگرس کی حمایت کے معنی میرے لغت میں یہ نہیں ہو سکتے کہ اگر اس میں کوئی خامی یا نقص پایا جائے تو میں اس کی بھی تعریف کروں اور اگر کسی وقت وہ اپنے مقصد یا عمل کے لحاظ سے قابل اعتراض ادارہ بن جائے تو بھی میں اس کا حامی بنا رہوں

ایک جماعت کی تنظیم کے دو پہلو ہوا کرتے ہیں ایک اس کا نظریہ، دوسرے اس کا عمل، یعنی پہلے ہم متعین کر لیتے ہیں کہ ہمارا مقصود کیا ہے اور پھر اس کے بعد اس کے حصول کے لئے تگ و دو شروع کرتے ہیں، گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اصول و عمل دو چیزیں ہیں جن پر حصول مدعا کا انحصار سمجھا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصول بالکل بیکار چیز ہے اگر ان پر عمل نہ کیا جائے اور اسی لئے دنیا میں جب کوئی انقلاب رونما ہوا تو وہ اصول کا نہیں بلکہ شخصیتوں کا مرہون منت تھا اور جب وہ شخصیتیں نہ رہیں تو اصول بھی بیکار ہو گئے

اس کی کھلی ہوئی مثالیں ہم کو تاریخ مذاہب میں ملتی ہیں۔ اسلام کے اصول آج بھی وہی ہیں جو تقریباً چودہ سو سال پہلے پائے جاتے تھے لیکن چونکہ شخصیتیں وہ نہیں ہیں اس لئے وہ اصول بالکل بے روح ہو کر رہ گئے ہیں۔ الغرض ہر اجتماعی ادارہ میں ہمیشہ انھیں دو پہلوؤں کو سامنے رکھ کر تبصرہ کیا جائے گا۔ اب آئیے اس کلیہ کو پیش نظر رکھ کر ہم کانگرس کا بھی تجزیہ کریں

کانگرس نے، ہمیشہ اس کا اعلان کیا کہ وہ ہندوستان کے لئے مکمل آزادی چاہتی ہے اور یہ ایسا اعلان ہے کہ اخلاقی و اصولی حیثیت سے دشمن کو بھی اس کی مخالفت نہیں ہو سکتی، لیکن اس وقت تک جتنی شخصیتیں اس مقصود کے حصول کے لئے اٹھیں، ان میں سوائے دو چار کے سب وہی تھیں، جن کی حلق سے تو یقیناً آزادی کی آواز نکلتی تھی، لیکن دل میں ان کے کچھ اور تھا جسے وہ ظاہر نہ کرتی تھیں —— وہ کچھ اور کیا تھا؟ —— اس کو میں آگے چلکر بیان کروں گا۔ سب سے پہلے ہم کو یہ سمجھنا چاہئے کہ

"مکمل آزادی" کا صحیح مفہوم کیا ہوسکتا ہے

سیاسیات کا ہر طالب علم واقف ہے کہ اب دورِ ملوکیت آخری سانسیں لے رہا ہے اور اس کی جگہ ڈماکریسی نے لیلی ہے لیکن ڈماکریسی سے میری مراد برطانیہ عظمیٰ کی سی اصطلاحی ڈماکریسی نہیں جس کے سامنے ارسٹاکریسی کی عیش پرستیاں اور عیاشیاں بھی شرما جاتی ہیں، بلکہ وہ حقیقی ڈماکریسی جو ملک کے تمام افراد کو انسانیت کی ایک ہی سطح پر دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کا نام آپ چاہے جمہوریت رکھئے یا اشتراکیت، فوضویت رکھئے یا عدمیت

نوعِ انسان کی غلامی کا ذمہ دار صرف یہ جذبہ ہے کہ ایک جماعت اپنے آپ کو دوسری جماعت سے بلند سمجھے اور اس جذبہ کی پرورش سب سے زیادہ دو چیزوں نے کی۔ ایک مذہب دوسری دولت، اس لئے اگر دنیا میں کوئی حکومت ایسی ہے جس میں مذہب و سرمایہ داری دونوں کی رعایت کی جاتی ہے تو چاہے وہ اُلوہی حکومت ہی کیوں نہ ہو، لیکن ہے غلامی کی حکومت اور ہم کبھی اس کو آزاد حکومت نہیں کہہ سکتے۔ پھر جس وقت کانگرس کی طرف سے "پورنا سوراج" کا اعلان ہوا تو میں نے غور کیا کہ کیا واقعی وہ مذہب و دولت کی دنیا سے علٰحدہ صرف "انسانیت" کے اُصول پر عمل کرے گی اور کیا ممکن ہے کہ "یہ خاکدانِ ہند" کسی وقت حکومت کے اس فردوسی تخیل کو بروئے کار لاسکے، لیکن قبل اس کے کہ میں کسی نتیجہ پر پہونچتا، خود کانگرس ہی کے طرزِ عمل نے بتادیا کہ اتنی بلند چیز سے اس کو نسبت دینا درست نہیں اور وہ قوم جو صدیوں سے غلامی کی زندگی بسر کرتی چلی آرہی ہے، اس کی بلند ترین آزادی کا تصور بھی غلامی کی بُو سے پاک نہیں ہوسکتا

میں اسوقت کانگرس کی ابتدائی یا درمیانی تاریخ سے بحث کرنا نہیں چاہتا اور نہ یہ ذکر مناسب ہے کیونکہ یہ زمانہ محض تجد وجہد کا تھا۔ بلکہ اس دور کو لیتا ہوں جب کوشش کے بعد نتائج پیدا ہونے لگتے ہیں اور آپ بھی میرے ساتھ غور کیجئے کہ کیا کانگرس واقعی "مکمل آزادی" کی طلبگار ہے

اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس وقت ہندوستان میں صرف ایک ہی شخصیت ہے جو کانگرس کے عروق میں خون کی طرح دوڑ رہی ہے اور جسے عرصہ سے ڈکٹیٹر کی حیثیت حاصل ہے۔ پھر اس شخصیت کے درخور سے پہلے کانگرس جو کچھ رہی ہو، لیکن اب وہ بالکل اسی کی آواز ہے، اسی کی نگاہ ہے اور اسی کی مرضی پر اس کی کارگاہ قایم ہے، اسی لئے اگر ہم کو گاندھی جی کی ذہنیت کا اندازہ ہوجائے تو کانگرس کا اُصولِ کار آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے

"پورنا سوراج" غالباً گاندھی جی کا وضع کیا ہوا لفظ ہے اور اس کی جو تفسیر انھوں نے بیان کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ترجمہ "آزادیِ کامل" ہی ہوسکتا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ لفظ پورنا کی جو عملی صورت گاندھی جی کے ذہن میں ہے، وہ یا تو اتنی ناقص ہے کہ ہم اس کا ترجمہ "کامل" کو بھی نہیں سکتے یا پھر وہ اتنی انتہا پسند ہے جسے ہم صرف عصبیت کہہ سکتے ہیں یا زیادہ واضح الفاظ میں "ہندو راج"

یقیناً گاندھی جی کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ ہندوستان میں خالص ہندو راج چاہتے ہیں ان کی توہین ہے اور میں

پورے وثوق کے ساتھ اس کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ واقعی ان کا منشا یہی ہے، لیکن اسی کے ساتھ ہمیں یہ حق بھی حاصل نہیں کہ ہم کسی کے مافی الضمیر سے بحث کریں۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتے ہیں کہ ایک شخص کے اقوال وافعال یا ارشادات وہدایات کو دیکھیں اور انھیں سے اس کے مقصود کا سراغ لگائیں

میں پہلے ظاہر کرچکا ہوں کہ ایک ملک کی کامل آزادی ایک کامل ڈماکریسی چاہتی ہے اور صحیح ڈماکریسی میں "مذہب و دولت" دونوں کا گزر نہیں لیکن گاندھی جی بذات خود نہایت شدید وشن پرست انسان ہیں اور مذہب کا کوئی ایسا بلند نظریہ ان کے سامنے نہیں ہے جو ملتوں کے اختلاف کو نظر انداز کردے۔ اسی کے ساتھ وہ سرمایہ دار طبقہ کے بھی حامی ہیں، ہرچند ان کی زندگی رشیوں کی سی زندگی ہے جس میں دنیاوی تعلقات سے کنارہ کشی اختیار کرلیجاتی ہے، لیکن بسا اوقات دنیا سے احتراز کرنا ہی، شدید دنیاوی تعلق بن جاتا ہے اور اس طرح جو اقتدار انسان کو حاصل ہوتا ہے، اس پر قیصر وکسریٰ کی حکومتیں بھی قربان ہیں۔ دولت کا مقصود بھی یہی ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ انسانوں کو اپنا فرمانبردار بنایا جاسکے اس لئے جب دولت سے احتراز اس مقصود کو پورا کرنے والا ثابت ہوتا ہے تو پھر فریبی نفس کے لئے کسی اور دولت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ صحیح ہے کہ اس صورت میں خالص ذاتی اغراض متعلق نہیں ہوتیں، لیکن ان کی جگہ اجتماعی اغراض لے لیتی ہیں اور عصبیت کی وہ صورت پیدا ہوجاتی ہے جس میں فرد کا مقابلہ فرد سے نہیں ہوتا، بلکہ ایک جماعت کا دوسری جماعت سے ہوتا ہے۔ الغرض گاندھی جی کا مقصد کیسا ہی پاک وصاف ہو، لیکن جو راہ انھوں نے کانگریس کے لئے متعین کی ہے، اس میں ضرور ایسی آلودگیاں نظر آتی ہیں، جو یک بلند تخیل کی ڈیماکریسی کے لئے ناقابل برداشت ہیں

گاندھی جی کے ڈپلومیٹ ہونے میں شک نہیں، لیکن انکی ڈپلومیسی میں وہ بلندی نہیں پائی جاتی جو خالص انسانیت پرست انسان کی راہ عمل میں پائی جانا چاہئے۔ ان کے عزائم میں ایک شیر کا سا ولولہ نہیں ہے بلکہ گھات میں لگے رہنے کا سا انداز ہے تاکہ کم سے کم خطرہ میں پڑکر زیادہ سے زیادہ فایدہ اٹھایا جائے۔ ان کی ستیاگرہ، اُن کا چرخا اور ان کا کھدر الغرض اُن کی ہر اسکیم میں، مطالبہ کا وہی انداز ہے جو ایک دھرنا دیکر بیٹھ جانے والے سائل کا ہوا کرتا ہے۔ ہرچند مقابلہ کی یہ صورت بہت سخت ہوا کرتی ہے اور دشمن ایک اخلاقی دباؤ محسوس کرکے پریشان ہوجاتا ہے، لیکن اس کامیابی کا ردِ عمل ہمیشہ تنگ نظری ہوا کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی کی ڈکٹیٹرشپ نے کانگرس کی طرف سے ملک کے بیشتر طبقوں کو بدظن کردیا ہے اور وہ کانگرسی حکومت میں وہ صاف باطنی نہیں پاتے جو مختلف الخیال جماعتوں میں اعتماد پیدا کرکے مرکزیت پیدا کردیتی ہے۔ یہ درست ہے کہ ملک کی اصلاح کے لئے گاندھی جی نے بہت کوشش کی لیکن یہ اصلاح بھی صرف اسی طبقہ تک محدود رہی جس سے وہ وابستہ ہیں، انھوں نے ہریجن تحریک سے ہندو جماعت کی اکثریت کو قوی کرکے کوئی فایدہ پہونچایا ہو تو پہونچایا ہو، لیکن اس سے ملک کو کوئی فایدہ نہیں پہونچا۔ اگر بجائے گاندھی جی کے کوئی ایسا شخص لیڈر ہوتا جو مذہب وسرمایہ داری سے متاثر نہ ہوتا، تو سب سے پہلے وہ ہندؤں اور مسلمانوں کی چھوت چھات کو دور کرتا جو ہریجن تحریک سے زیادہ ضروری تھا، لیکن چونکہ گاندھی جی سخت قسم کے

ہندو ہونے کی وجہ سے خود بھی مسلمانوں کے ساتھ کھانے پینے کو اچھا نہیں سمجھتے اور سرمایہ دار ہندوؤں سے بگاڑنا بھی مناسب نہیں جانتے اس لئے انھوں نے ذات پات مٹانے کی تحریک اسی جماعت میں شروع کی جو بہرنوع ہندو تھی یا ہندویت سے قریب تر، اور مسلمانوں کو بدستور ملکش رہنے دیا۔ الغرض گاندھی جی نے پورنا سوراج کا تو اعلان کر دیا۔ لیکن اس کے حصول کے لئے جو رادِ عمل انھوں نے متعین کی وہ مستعمراتی آزادی کی منزل سے آگے نہیں جاتی، اور حقیقت یہ ہے کہ ہندو جماعت جس کا ذہن آزادی کامل کے تصور سے بالکل خالی ہے، اس سے زیادہ کی تمنا کر بھی نہیں سکتی

اب دیکھئے کہ قبول وزارت کے بعد کیا ہوا اور کانگرسی حکومت سے پبلک کو کیا فایدہ پہونچا۔ دنیا کی اور چیزوں کی طرح حکومت کے بھی دو پہلو ہوا کرتے ہیں، داخلی و خارجی۔ خارجی پہلو کے متعلق تو خیر کچھ کہنا ہی فضول ہے، کیونکہ صفائی و پاکیزگی کا جو مفہوم ہندو قوم نے متعین کیا ہے وہ بالکل علٰحدہ ہے اور اس لئے اگر ہم کو کانگرسی حکومت کے دفاتر میں ظاہری بدترتیبی، گندگی اور پھوہڑپن نظر آتا ہے تو حیرت نہ کرنا چاہئے، لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اس کا داخلی پہلو بھی قابل تعریف نہیں اور یہی وہ چیز ہے جو ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتی ہے کہ ہندؤں کا واقعی منشا کیا ہے اور گاندھی جی کی رہنمائی میں کونسی ذہنیت نشوونما پا رہی ہے

اس سے انکار ممکن نہیں کہ ان صوبوں میں جہاں کانگرس کی حکومت ہے، ہندؤں کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کو انھوں نے ستایا تو حکومت ان کی مدد کرے گی۔ یقیناً کانگرس حکومت نے کبھی سرکاری طور پر اس کا اعلان نہیں کیا کہ وہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں ہندؤں کا ساتھ دیگی، لیکن اس کے عمل سے یہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ اس باب میں سب سے بڑا الزام جو کانگرس حکومتوں پر قایم کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی پیدا کی ہوئی ذہنیت مسلمانوں کے ساتھ اتحاد کے بجائے اور زیادہ افتراق کی صورتیں پیدا کرتی چلی جا رہی ہے۔ یہ ہم اس سے پہلے بھی کئی بار لکھ چکے ہیں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت ہندؤں سے بالکل مختلف ہے اور ہندؤں نے اگر انکی خصوصیات، قومی کو ملحوظ نہ رکھا تو اتحاد ناممکن ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ زبان کا ہے لیکن بدقسمتی سے اسکو بہت معمولی سمجھا جاتا ہے

آل انڈیا کانگرس کمیٹی اعلان کرتی ہے کہ وہ ایک مشترک زبان "ہندوستانی" کے نام سے رائج کرنا چاہتی ہے جو اُردو و ہندی رسم خط دونوں میں لکھی جائے۔ لیکن کانگرس حکومتوں کو جو مطلب اس کا بتایا جاتا ہے وہ کچھ اور ہے۔ چنانچہ ہمارے صوبہ کی حکومت کا طرزِ عمل ملاحظہ ہو کہ جب کسی مضمون یا قانون کا ترجمہ انگریزی سے ہندوستانی میں کیا جاتا ہے تو اُردو میں علٰحدہ اور ہندی میں علٰحدہ، یعنی ان دونوں ترجموں میں صرف رسم خط کا اختلاف نہیں ہوتا بلکہ الفاظ کا بھی ہوتا ہے اور ایسا نمایاں اختلاف کہ دونوں ترجمے دو مختلف زبانوں کے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا مشترک زبان پیدا کرنے کی یہی صورت ہوا کرتی ہے۔

ہندوستانی مشترک زبان کی خصوصیت صرف یہ ہونی چاہئے کہ ہر شخص اس کے الفاظ کا مفہوم آسانی سے سمجھ سکے

خواہ وہ الفاظ عربی فارسی کے ہوں یا انگریزی و سنسکرت کے ۔لیکن ہمارے صوبہ کی کانگرسی حکومت نے ہندوستانی "زبان" کا معیار یہ قرار دیا ہے کہ ہر وہ لفظ جو فارسی یا عربی الاصل ہے خارج کر دینے کے قابل ہے، خواہ وہ کتنا ہی عام فہم کیوں نہ ہو

اس وقت قانونی کتابوں کے جو ترجمے یہاں رائج ہیں اُن سے گاؤں والے بھی مانوس ہو چکے ہیں اور اس حد تک کہ ساقط الملکیت وغیرہ ایسے الفاظ بھی وہ سمجھ جاتے ہیں، لیکن کانگرسی حکومت ان کی روادار نہیں اور وہ بجائے ان کے اور الفاظ کی جستجو میں ہیں۔غالباً نامناسب نہ ہوگا اگر اس سلسلہ میں اس ذہنیت کے بعض لطایف یہاں بیان کر دئے جائیں ۔

ترجمہ کمیٹی کے سامنے لفظ Enforce یا Applicable کے ترجمہ کا سوال پیش تھا، اس وقت اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا تھا کہ " یہ قانون فلاں فلاں جگہ نافذ ہوگا"، اور ہر شخص اسے سمجھ لیتا تھا لیکن چونکہ نافذ عربی الاصل ہے اس لئے اس کو نکالدیا گیا اور اسکی جگہ لاگو کا لفظ تجویز کیا گیا چنانچہ اب جو ترجمے شایع ہو رہے ہیں ان میں یہ عبارت یوں نظر آئے گی کہ " یہ قانون فلاں فلاں جگہ لاگو ہوگا" گویا قانون کوئی بھیڑیا ہے جو کبھی کبھی لاگو بھی ہو جاتا ہے

حال ہی کی بات ہے کہ یہاں کی وزارت کے ایک نہایت زبردست رُکن نے تجویز پیش کی کہ :۔ "صوبۂ متحدہ" کا نام بھی کوئی دوسرا ہونا چاہئے، لوگوں نے پوچھا کوئی نام آپ ہی تجویز فرمائیے، انھوں نے نہایت غور و فکر کے بعد انتہائی متانت سے فرمایا کہ میری رائے میں بجائے "صوبۂ متحدہ" کے بجائے "جُٹ صوبہ" زیادہ موزوں ہوگا ۔اس سے زیادہ دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ جسوقت (Supplementry question) کا ترجمہ آپ سے دریافت کیا گیا تو آپ نے بلا تامل فرمایا کہ :۔ " دُم سوال " ——— جل جلالہ ——— " بوجھیں لال بجھکڑ اور نہ بوجھے کوئے"

اس سے بحث نہیں کہ ان کے تجویز کئے ہوئے ترجمے منظور کئے گئے یا نہیں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا ذہنیت تھی جس نے انھیں اس گل افشانی پر مجبور کیا

یہ حال ہے ارکانِ وزارت اور اکابر کانگرس کے تعصب کا جو کونسل چیمبر کے حال میں دن دہاڑے برتا جا رہا ہے اور اسی سے آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ دفاتر میں جو پہلے ہی سے مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں کا مرکز بنے ہوئے ہیں، کیا کچھ نہ ہوتا ہوگا ۔ کانگرس کی وزارت سے پہلے جب کسی مسئلہ میں مجسٹریٹ ضلع کی رپورٹ استناداً پیش کی جاتی تھی تو

کہا جاتا تھا کہ اس رپورٹ کا کیا اعتبار، لیکن آج جب بدامنی یا ہندو مظالم چھپانے کی ضرورت ہوتی ہے تو اسی مجسٹریٹ کی رپورٹ کو بطور سند پیش کیا جاتا ہے اور معترض کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اس کا یقین کرے

میں نے بہت غور کیا کہ ایسا کیوں ہے اور ہندوؤں کی ذہنیتوں میں یہ تغیر کیوں ہوا، تو اس کا سبب سوائے اسکے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مسلمانوں سے بالکل علٰحدہ ہو کر اپنی حکومت قایم کرنا چاہتے ہیں اور ہندوستان میں اسی کو زندہ رہنے کا مستحق سمجھتے ہیں جو گایتری کا جاپ کر سکتا ہے اور گائے کی پوجا ــــ ہندو مہاسبھا اور اس جماعت میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ وہ علی الاعلان مسلمانوں کی مخالف ہے اور یہ گھات سے کام لے رہی ہے

اس سے قبل کی اشاعت میں، یہ ظاہر کر چکا ہوں کہ کانگرس بظاہر وفاق کی مخالف ہے، لیکن جب وقت آئے گا تو وہ ضرور اس میں شریک ہو جائے گی۔ گاندھی جی اور لارڈ لنتھگو کی ملاقات کا بھی یہی مقصود تھا اور اب مسٹر جینا سے جو گفتگو ہو رہی ہے وہ بھی اسی غرض کی تکمیل کے لئے ہے۔ پھر ہو سکتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو بعض مخصوص رعایتوں کا سبز باغ دکھا کر وفاق کے لئے آمادہ کر لیا جائے، لیکن اس سے مسلمانوں کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہندوؤں کا زاویۂ نظر حکومت کے باب میں بدلگیا ہے۔ وہ اگر مستعمراتی آزادی پر راضی ہیں تو اس لئے کہ برطانیہ عظمٰی کی "کامن ویلتھ" سے متعلق ہوئے بغیر وہ یہاں اپنے ہندو راج کے خواب کو پورا ہوتے نہیں دیکھ سکتے اور وہ اس وقت کچھ کھونے کے بعد بھی یہ سودا کرنے کے لئے طیار ہو جائیں گے

لیکن مسلمانوں کو ضرور اپنی جگہ سوچنا چاہئے کہ انھیں کیا کرنا ہے۔ میں نے ہمیشہ یہی کہا اور اب پھر کہتا ہوں کہ وہ کانگرس کی اس پالیسی کا جواب کانگرس میں شریک ہونے کے بعد ہی دے سکتے ہیں۔ کانگرس اپنا نصب العین کامل آزادی متعین کر چکی ہے اور مسلمانوں کا مطمح نظر بھی یہی ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ یہ کانگرس میں شریک ہونے سے احتراز کریں

کانگرس اگر ہندو جماعت میں تبدیل ہو گئی ہے تو اس کے ذمہ دار بھی مسلمان ہی ہیں اور اگر وہ اسی طرح آہستہ آہستہ ہندو راج کی تشکیل میں کامیاب ہو گئی تو اس کی ذمہ داری بھی مسلمانوں ہی پر عاید ہو گی ــــ لیکن انفرادی طور پر چند نفوس کی شرکت کوئی معنی نہیں رکھتی ــ ضرورت ہے کہ اجتماعی حیثیت سے جوق در جوق شرکت کی جائے اور کانگرسی وزارتوں کے اس طرز عمل پر جو مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہو نکتہ چینی کی جائے اور اس کے خلاف نہایت وسیع محاذ جنگ طیار کیا جائے

مسلمانوں کی شرکت سے کانگرس کی موجودہ پالیسی کا بدلجانا بالکل یقینی ہے، کیونکہ مسلمان کبھی مستعمراتی آزادی کا نصب العین لیکر کانگرس میں نہیں جائے گا، بلکہ آزادی کامل کو اپنا مقصود قرار دیکر اس میں شریک ہو گا اور اس طرح کانگرس کی سوشلسٹ جماعت جسے گاندھی جی نے خدا جانے کس طرح اپنے قابو میں کر رکھا ہے قوی ہو جائے گی اور وفاق کے بعد جو ذلت آمیز سودا "ڈومی نین ہوم رول" کا کانگرس کے پیش نظر ہے اس سے ملک کو نجات حاصل ہو جائے گی۔

دہلی و لکھنؤ اسکول کی شاعری

(مولانا عبدالمالک آروی کا مقالہ جو انجمن بہار ادب لکھنؤ کے سالانہ جلسہ میں پڑھا گیا)

فلسفہ کے مختلف مسالک، تصوف کے مختلف خانوادوں، فن مصوری و موسیقی کے مختلف اسکول کی طرح شاعری کے بھی بہت سے اسکول گزرے ہیں۔ اور جب تک فطرت انسانی میں تنوع اور طبایع میں اختلاف و تضاد قایم ہے۔ اسی طرح مسلک و اسکول کی تخلیق بھی ہوتی رہیگی صرف فلسفہ یونان کی تاریخ میں سالیس ملیطی سے لیکر فلاطینوس تک تقریباً ایک درجن فلسفہ کے مختلف مسالک کی ہنگامہ زائیاں رہیں کبھی پیروان زد و نوفن کو فروغ رہا کبھی سوفسطائیہ کو کبھی اکادیمیین مشائین اور رواقیون، کی سرگرمیاں رہیں کبھی ابیقورین متشککین اور اشراقیون کی گیرائیاں، ہندوستان میں بھی فلسفہ ویدانت، وسانکھیہ، مذاہب جین اور بدھ اسی اختلاف نظر و فکر کی پیداوار ہیں، تصوف کی دنیا میں آیئے وہاں بھی وجود و فنا، عرفان و حضور کے نظریوں کا اختلاف نظر آئے گا ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ قادریہ و چشتیہ سہروردیہ و فردوسیہ کے خانوادے معرض وجود میں آتے، مصوری کی تاریخ میں بھی آپ کو اطالوی، ایرانی راجپوت و مغل چینی و جاپانی آرٹ کی رنگینیاں نظر آئیں گی، موسیقی کا بھی یہی حال ہے، مولدات بصرہ اور قینات حجاز اسلامی موسیقی کی تاریخی حقیقتیں ہیں پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ شاعری کی دنیا اس کلیہ سے ممتاز رہتی، چنانچہ یہاں بھی آپ کو طرز و ادا کا یہی اختلاف مختلف اسکول کی شکل میں نظر آئے گا، اس وقت میں صرف اُردو شاعری سے بحث کروں گا۔

تاریخ و تذکروں میں اُردو شاعری کے صرف دو اسکولوں کا نام لیا جاتا ہے، یعنی دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول، لطف یہ ہے کہ اگر صرف دہلوی اور لکھنوی تذکروں میں یہ تخصیص و تعیین پائی جاتی تو تعجب کی بات نہ تھی، کیونکہ بہار اور دکن اُردو کے ان مرکزی مقامات سے اسقدر دور واقع ہوئے ہیں کہ میر و قایم گردیزی، و میر حسن سے یہ توقع کرنا درست نہیں کہ وہ بہار و دکن کی خدمات اُردو کو اس عہد میں جسوقت ذرایع رسل و رسایل میں اتنی آسانیاں نہ تھیں۔ بہ وضاحت بیان کریں گے متوسطین تذکرہ نگاروں میں مصحفی نے البتہ بہار کی طرف کافی توجہ کی، دکنی تذکرے بالخصوص خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی کا تذکرہ "گلشن گفتار" خود دہلی شعرا کے حالات سے بڑی حد تک تشنہ ہے، "چمنستان شعرا" شفیق کا بھی یہی حال ہے، گو "گلشن گفتار" کی ایجاز و اختصار کے بدلے اس میں تفصیل و اطناب پایا جاتا ہے، بہاری تذکروں میں سے اکثر طبع ہی نہ ہوئے اور جو طبع بھی ہوئے وہ اب ناپید ہیں،

انجمن ترقی اُردو دکن اور مولانا عبدالحق صاحب کا ملک کو ممنون ہونا چاہیئے کہ ان کی کوششوں کی بدولت اہم اور مفید تذکرے شایع ہوئے، انھیں میں تذکرۂ گلزار ابراہیم (نواب ابراہیم خاں خلیل) اور تذکرۂ "گلشن ہند" (مرزا علی لطف) ہیں، خلیل نے آنحوش بہار میں نشو و نما پائی لطف، بہاری نہیں ہیں لیکن "گلشن بیخار" شیفتہ کی روایت کے مطابق وہ کچھ دنوں نواح عظیم آباد میں بھی رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ علی لطف نے اپنے تذکرہ میں جو گلزار ابراہیم سے ماخوذ ہے۔ بہاری شعراء کے حالات لکھے ہیں، ان تذکروں کے علاوہ بہار کے مشہور تذکرے، تذکرۂ عشقی، تذکرۂ شورش، تذکرۂ روز روشن و "معراج الخیال"، عبرتی، بہار کے محققین کے علاوہ دہلی، لکھنؤ اور دکن کے ارباب فکر و ذوق کی نظروں سے ناپید ہیں، بہار کے دور متاخرین میں بعض شعراء نے مفید تذکرے لکھے اور وہ طبع ہو کر اطراف ملک میں پہونچے بھی مثلاً شوق نیموی کا تذکرہ "یادگار وطن" شاد کی "نوائے وطن" اور "حیات فریاد" صفیر کا تذکرہ "جلوۂ خضر" نواب امداد امام اثر کی "کاشف الحقایق" شوق اور شاد کے تذکروں میں عموماً معاصرین کے حالات ہیں جلوۂ خضر اور کاشف الحقایق بہت بسیط تذکرے ہیں لیکن بہار کے چند شعراء کے کمالات کا اعتراف کرنے کے علاوہ، ان میں کوئی بہاری شاعری کی خصوصیات سے بحث نہیں کرتا، صفیر نے تو یہاں تک لکھدیا کہ زبان اُردو کا عروج، دہلی اور لکھنؤ تک محدود ہے، (جلوۂ خضر جلد ۲۔ ص ۱۲) لیکن میری یہ تحقیق ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کی طرح دکن اور بہار کے بھی مخصوص اسکول ہیں جس طرح حکومت کی سرپرستی، ایرانی صوفیہ و شعراء کی آمد اور مقامی اثرات نے دہلی و لکھنؤ اسکول کی تخلیق کی، انھیں اثرات کے ماتحت بہار اور دکن میں بھی اُردو شاعری کو عروج ہوا

سب سے پہلے یہ غور کرنا ہے کہ دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کی تخلیق جن اثرات کے اتحت ہوئی بہار اور دکن پر بھی وہی اثرات مترتب ہوئے یا نہیں، محض اس بنا پر کہ بہار یا دکن میں دہلی اور لکھنؤ سے شعراء گئے اور انھوں نے وہاں اپنا اثر پیدا کیا۔ بہار اور دکن کے اسکول شاعری کو دہلی اور لکھنؤ کا پرتو نہیں کہا جا سکتا، بیشک بہار میں دہلی سے کثیر تعداد میں شعراء آئے قائم و میر حسن نے اپنے تذکروں میں ان کا حال لکھا ہے، صحفی نے تذکرہ "ہندی گویان" میں اور خلیل نے "گلزار ابراہیم" میں ان کے نام گنائے ہیں ان تذکرہ نگاروں کی روایات کے مطابق نشاں، فدوی، ضیاء، عشق دہلی سے بہار میں آکر بہت دنوں رہے، اور ان میں بعض یہیں سپرد خاک ہو گئے، شاہ رکن الدین عشق تو بہت پھولے پھلے، آپ صوفی سجادہ نشین تھے، مریدوں کا حلقہ ہو گیا، آج بھی پٹنہ میں آپکی خانقاہ "منکیہ شریف" کے نام سے موجود ہے جہاں سالانہ عرس ہوا کرتا ہے

خود بہار کے مشہور غزل گو شیخ غلام علی راسخ (متوفی ۱۲۳۸ھ) میر سے جا کر ملے[1] شاد کہتے ہیں یہ ملاقات لکھنؤ میں ہوئی اشکی و جمال نے خواجہ میر درد سے شرف نیاز حاصل کیا[2] لکھنؤ سے مرزا دبیر و میر انیس اور ان کے برادران و عزیزان باکمال بارہ سال تک مسلسل ہر سال مہینوں تک پٹنہ میں مہمان رہتے[3] اور دبیر نے تو آرہ کو بھی رونق بخشی، امیر مینائی ۱۳۰۵ھ میں عظیم آباد

---

[1] تذکرہ آبحیات ۔ [2] حیات فریاد ۔ [3] جلوۂ خضر جلد ۲، ص ۴۶۲ ۔

میں تشریف لائے اور لوگوں کو اپنے کلام سے محظوظ فرمایا[1]، محض اس آمد و رفت سے بہار کو دہلی یا لکھنؤ کا ذیلی رہا نہیں کہا جا سکتا، ورنہ پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ دہلی اسکول کی تخلیق دکن سے ہوئی، اور لکھنؤ اسکول دہلی اسکول کی پیداوار ہے، تذکروں میں مذکور ہے کہ ولی دکنی کا دیوان دہلی میں آیا تو لوگوں نے ریختہ گوئی کی طرف توجہ کی[2]۔ اسی طرح دہلی سے میر و سودا، ضاحک و انشا، ضیا و حسن، مصحفی و جرأت وغیرہ کا لکھنؤ میں آکر سکونت اختیار کرنا تذکروں میں موجود ہے، ان واقعات کے ہوتے ہوئے اگر دہلی اسکول کی اصلیت تسلیم کی جاتی ہے، اور لکھنؤ اسکول کو دہلی اسکول کا پرتو نہیں کہا جاتا، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ صفیر بلگرامی کی طرح اردو زبان کی ترقی و عروج کو دہلی اور لکھنؤ تک محدود کر دیا جائے، اور بہار و دکن کو اس کا خوشہ چیں سمجھ لیا جائے۔

دنیا میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک ہی دور میں ایک ہی قسم کے اثرات و ماحول نے چند مسالک کی تخلیق کی، فلسفہ و مذہب دونوں کی تاریخیں اس حقیقت سے مالا مال ہیں یہودی فلسفۂ اسکندریہ اور فلسفۂ اشراقی دونوں ایک ہی دور کی چیزیں ہیں، سابق الذکر کے علمبردار "فیلو" ( ) اور آخر الذکر کے بانی فلاطینوس ( ) دونوں کے افکار میں مماثلت پائی جاتی ہے بعض سطحی اہل قلم نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے اثر و تاثر، فعل و انفعال کا نتیجہ بتایا لیکن محققین کے نزدیک یہ نظریہ حقیقت سے دور ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہودیوں سے یونانی بت پرست نفرت رکھتے تھے، اور اس لئے یہ کبھی ممکن نہ تھا کہ ان میں باہم اثر و تاثر کی کارفرمائیاں ہوتیں اس لئے اہل نظر و تحقیق نے یہ فیصلہ کیا کہ فلسفہ کے ان دونوں اسکولوں نے ایک ہی اثر کے ماتحت خود مختارانہ ترقی کی، بدھ و جین مذاہب کی تاریخ میں بھی اسی قسم کی شہادت ملتی ہے قدیم علماء کا خیال تھا کہ یہ دونوں ایک ہی مسلک کے دو نام ہیں، یا پھر جین مذہب بدھ مذہب کا پرتو ہے درانحالیکہ اس کو واقعہ سے کوئی سروکار نہیں جین مذہب بدھ مذہب سے بہت قدیم ہے

یہی حال بہار و دکن کے اسکولوں کا ہے۔ ہر چند اس وقت وضاحت کے ساتھ اس پر بحث نہیں ہو سکتی، کہ دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ اور کیا یہی اجزائے ترکیبی بہار اور دکن اسکول کی تخلیق میں معاون ہوئے، پھر بھی ایجاز و اختصار کے ساتھ عرض کیا جائے گا

دہلی اسکول کی تخلیق میں ایرانی شعراء و صوفیہ کی آمد اور سلاطین و امراء کی ادب نوازی و دانش گرم کو بڑا دخل ہے، چنانچہ محمد مقیم ہروی، (صاحب اکبر نامہ) اور بدایونی (صاحب منتخب التواریخ) نے سیکڑوں شعراء کے نام گنائے ہیں، جو عہد اکبری میں وارد ہندوستان ہوئے، عبدالباقی نہاوندی نے عبدالرحیم خانخاناں کے نام سے "مآثر رحیمی" لکھی، اور خانخاناں کی تجارت دریا دلی اور علم دوستی کے بے شمار واقعات سپرد قلم کئے، عرفی، ظہوری، نظیری، ملک قمی سیکڑوں شعراء اس کے خوان کرم کے ریزہ چیں تھے، اس کے بعد جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب تک برابر شعرائے ایران کی آمد رہی، صاحب، رکنا، کاشی، ابوطالب کلیم

---

[1] جلوۂ خضر جلد ۲ ص ۲۸۹ ۔ [2] مخزن نکات ص ۱۰ ۔ تذکرہ جلوۂ خضر جلد ۱ ص ۷۹ ۔ ۸۷ ۔

طالب آملی، مرزا موسوی خاں فطرت اسی دور میں آئے، تذکرہ کلمات الشعرا سرخوش اس دور کی ادبی سرگزشت کی مختصر مگر جامع تاریخ ہے اس کے بعد سلطنتِ مغلیہ کا سب سے خطرناک، لیکن علمی و ادبی حیثیت سے نہایت تابناک دور محمد شاہ کے عہد حکومت سے شروع ہوتا ہے، یہیں سے فارسی، اُردو میں منتقل ہوتی ہے، اور یہیں سے دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کے فرق و امتیاز کی بنیاد پڑتی ہے۔ عہد متاخرین کے مشہور فارسی شعرا اور اُردو کے اکابر شعرا اسی دور کی پیداوار ہیں، اس عہد میں والہ داغستانی علی حزیں ہندوستان میں آئے، آزاد بلگرامی اور خان آرزو کا یہی دور تھا۔ اسی عہد کے مستند علمی حالات "ریاض الشعراء" (والہ داغستانی) "مجمع النفائس" (خان آرزو) "سرو آزاد" (غلام علی آزاد بلگرامی) اور "تذکرۃ الاحوال" (شیخ علی حزیں) میں ملتے ہیں۔ میر تقی، قائم اور گردیزی نے شعرائے ریختہ کے حالات میں اپنے تذکرے کسی قدر تقدم و تاخر کے ساتھ اسی عہد میں لکھے ان تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ فارسی شعراء تیزی کے ساتھ ریختہ کی طرف رجوع کرتے جاتے تھے، الغرض ایرانی شعراء کی آمد، فارسی و ہندوستانی زبان کے میل جول، اور سلاطین و امراء کی علمی و ادبی سرپرستی نے اُردو شاعری میں دہلی اسکول کی بنیاد ڈالی، اب آیئے ہم بتائیں کہ بہار و دکن میں انھیں اثرات نے خود مختارانہ اُردو کو نشو و نما دی، دکن کے متعلق صرف اشارے کروں گا، عہد بہمنیہ میں حافظ و جامی کو بلانے کے لئے ایران میں دعوت نامہ جاتا ہے، حافظ شیرازی ہرمز تک آتے ہیں لیکن پھر وطن واپس چلے جاتے ہیں، جامی خواجہ محمود گاوان وزیر اعظم سے معذرت کر لیتے ہیں، شیخ آذری اسفرائنی احمد شاہ بہمنی کے زمانہ میں دکن میں آتے ہیں، فیروز شاہ بہمنی خود بڑا شاعر تھا، تاریخ فرشتہ میں اس کے اشعار بہت ہیں عروجی تخلص کرتا تھا، آوان عادلشاہیہ میں بھی سلاطین نے شاعری کی، یوسف عادل شاہ و قافا بلند پایہ شعرا گزرے ہیں، قطب شاہی حکومت کا بانی سلطان قلی قطب شاہ خود ریختہ کا شاعر گزرا ہے، قائم کی روایت کے مطابق محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ میں ریختہ گوئی کو بڑا عروج تھا اسی زمانہ میں استر آباد سے میر مومن تشریف لائے ان کو حکومت کے معاملات میں بھی دخل تھا، شفیق دکنی نے اپنے تذکرہ "شام غریباں" میں ان ایرانی شعرا کو جمع کر دیا ہے جو ہندوستان میں آئے۔ بہار میں بھی شعرائے ایران اور صوفیہ کی آمد رہی، تذکرہ صبح صادق میں ان کثیر ایرانی شعراء کے حالات مذکور ہیں جو عظیم آباد میں مقیم رہے، خان آرزو نے مجمع النفائس میں شیخ علی حزیں کے ورود عظیم آباد کا حال لکھا ہے ..... عہد عالمگیری کے مشہور ایرانی شاعر معز فطرت بھی عظیم آباد کے حاکم مقرر ہو کر گئے تھے، ان کا ایک فارسی اُردو مخلوط شعر نکات الشعرا، مخزن نکات، اور جلوۂ خضر (جلد ا صفحہ ۱۰۷) میں مذکور ہے، عظیم آباد میں ایرانی شعراء کی اس آمد کا سلسلہ شاد کے زمانہ تک جاری رہا، چنانچہ انھوں نے بھی ملا حاجی بابا کا ذکر کیا ہے، (ملاحظہ ہو حیات فریاد ص ۱۳۲) بہار نے جو شش راسخ اور شاد پیدا کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اس کا بھی ایک مخصوص اسکول ہے اور خود ہمارے عہد کے مایۂ ناز مفکر حضرت نیاز کا یہ قول کہ "شاد کا مثل نہ تو دہلی اسکول میں کوئی شاعر ہوا اور نہ لکھنؤ اسکول میں" اس حقیقت پر مہر توثیق ثبت کر دیتا ہے۔ خیر یہاں تک تو ایک ضمنی بحث تھی، اب آیئے غور کریں کہ اصطلاحات دہلی اسکول، اور لکھنؤ اسکول کی کیا تعریف ہے؟ عام طور پر جذبات کی شاعری کو دہلی اسکول کی شاعری اور صنائع بدائع اور لفظی تکلفات کو لکھنؤ کی شاعری سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسی لحاظ سے دہلی اسکول کی

شاعری میر سے شروع ہوکر غالب پر ختم ہوتی ہے اور لکھنؤ اسکول کا دور ناسخ سے شروع ہوکر امیر وغیرہ پر تمام ہوتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ میر سے قبل اُردو شعراء، خان آرزو، شاہ حاتم، آبرو کو کس اسکول کی طرف منسوب کیا جائے گا، میں شاکر ناجی، یکرنگ وغیرہ کو نظر انداز کر دیتا ہوں، حالانکہ یہ لوگ بھی سلسلۂ ارتقا کی کڑی کے لحاظ سے اپنی جگہ سنگین حقیقتیں ہیں، میں یہ تقسیم ماننے کے لئے طیار نہیں کہ جس مقام اور ماحول میں افراد کے اندر انقلاب ہو اور وہ افراد کوئی سیاسی یا ادبی شاہراہ اختیار کریں تو اس سیاست و ادب کو اسی مقام اور ماحول کی طرف منسوب ہونا چاہیئے۔ غالب کے بعد دہلی میں کون شاعر ہوا جس نے دہلی اسکول کی صحیح علمبرداری کی۔ بعض اصحاب نسیم اور داغ کا نام لیں گے لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں" داغ کی زبان دہلوی تھی، لیکن ان کے جذبات پر اودھ ہی کے تخیلات کام کر رہے تھے، وہ دہلی اور لکھنؤ اسکول کے امتزاج و اختلاط کا حقیقی آئینہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ یوپی کے مشاہیر شعرا ریاض[1] نے داغ ہی کے دامن تربیت میں پناہ لی، داغ کے رجحان و ذوق پر اودھ کی رنگینیاں اثر انداز تھیں، اسی ہمرنگی نے یو۔پی کے اور شعراء کو بھی داغ کی طرف متوجہ کر دیا

یہ حقیقت ہے کہ لکھنؤ اسکول، غازی الدین حیدر سے قبل کوئی چیز نہ تھا، میں نے ابھی ابھی ظاہر کیا ہے کہ دور محمد شاہی سیاسی اعتبار سے بہت زیادہ نازک تھا لیکن ادبی اعتبار سے حد درجہ انقلاب آفریں گزرا ہے، اسی عہد یعنی ۱۱۳۲ھ میں سلطان محمد شاہ رنگیلے کی طرف سے سید محمد امین کاظمی اودھ کے صوبہ دار مقرر ہوئے، یہ نیشاپور کے رہنے والے تھے، یہی سلطنت اودھ کے بانی گزرے ہیں، انھوں نے شیخ زادوں کو نکال کر لکھنؤ پر قبضہ کیا، ان کے بعد ان کے داماد ابو المنصور صفدر جنگ صوبہ دار اودھ ہوئے جب ۱۱۶۶ھ میں ان کا انتقال ہوگیا تو شجاع الدولہ کو صوبہ داری ملی، یہ بھی ۱۱۸۸ھ میں رہبر ملک بقا ہوئے ان کے بعد نواب آصف الدولہ نے صوبہ کی حکومت سنبھالی آصف الدولہ خود بڑے پایہ کے شاعر تھے، آصفؔ تخلص کرتے تھے، دہلی میں شاہ عالم آفتاب شعر کہتے تھے، اسی زمانہ میں کسی قدر تقدم و تاخر کے ساتھ، میرزا مظہر، خان آرزو، میر اور سودا گزرے ہیں، آصف الدولہ نے ۱۲۱۲ھ میں رحلت کی، نواب سعادت علی خاں نے صوبہ داری کا نظم و نسق شروع کیا، اسی عہد میں انشاء اور خلیل نے مشترکہ سعی سے اُردو کی مایۂ ناز کتاب "دریائے لطافت" لکھی ۱۲۲۹ھ میں سعادت علی خاں نے وفات پائی، اور غازی الدین حیدر نے عنان حکومت ہاتھ میں لی، اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا، انگریزوں نے غازی الدین حیدر کو مطلق العنان بادشاہ بنا دیا اور حکومت کی تبدیلی کے ساتھ زبان میں بھی تبدیلی ہوئی۔ ابھی تک لکھنؤ دہلی اسکول کا تبع تھا۔

میر و مرزا، صنا، حک و ضیا، انشا و جرأت شعرائے دہلی کا دور دورہ تھا، کہ قدرت نے اُردو شاعری میں انقلاب کی ضرورت سمجھی اور اسی نے ناسخ کی تخلیق کی۔ "ما ننسخ من آیۃ او ننسہا نأت بخیر منہا او مثلہا"۔ ناسخ نے فک زبان کی اصلاح کی طرف توجہ کی دہلی اسکول میں میر و مرزا نے بھی اصلاحیں کی تھیں، لیکن ناسخ کی اصلاحات و اُصول زبان نے اُردو کی

---

[1] ریاض خیرآبادی نے کبھی داغ سے اصلاح نہیں لی، ریاض فی الحقیقت امیر کے شاگرد تھے لیکن بعد کو امیر مینائی سے بھی کچھ دنوں استفادہ کیا۔ (نیاز)

کا یا پلٹ دی، دہلی اسکول میں مومن کے زمانہ تک اُردو کا وہ انداز نہ تھا، جو ناسخ نے ان سے بہت قبل لکھنؤ اسکول میں جاری کر دیا تھا، ناسخ نے زبان اُردو پر جو احسانات کئے ہیں وہ لسانیات کی نہایت اہم چیزیں ہیں، اس سلسلہ میں صفیر بلگرامی کی جلوۂ خضر (جلد ۲ ص ۳۲-۱۰۴) قابل مطالعہ ہے۔ ناسخ کے عہد میں لکھنؤ کے اندر خواجہ آتش بھی تھے۔ ایک طرف ناسخ اور ان کے تلامذہ رشک، برق، وزیر، بحر، آباد، سحر، شہید، اثر، کوثر اور مسیحا لکھنؤ اسکول کو چار چاند لگا رہے تھے، دوسری طرف انکے ہمچشم خواجہ آتش اور ان کے تلامذہ اصغر، اعظم، افضل، اوج، بسمل وغیرہ یا بقول صفیر "۳۸ ماہ اوج کمال" اپنی ضیا باریوں سے لکھنؤ اسکول کے نخل کی آبیاری کر رہے تھے۔ ناسخ اسکول نے بہار پر بھی بہت اثر ڈالا تھا، چنانچہ اسی خانوادہ کے مشہور چشم و چراغ شمشاد نے شوق، نیموی، قیس آروی، تمنا پھولواروی اور بدر آروی پیدا کئے، لیکن زمانہ نے اتنی کروٹیں بدلیں، زبان و طرز بیان میں اتنا انقلاب ہو گیا کہ اب نہ تو دہلی اسکول ہی باقی ہے اور نہ لکھنؤ اسکول اور نہ صرف اودھ بلکہ بہار میں بھی ناسخ اسکول کے چند بے کیف اور بے مایہ مقلدین سسک رہے ہیں، یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ زبان اُردو اس قدر آگے بڑھ گئی ہے، کہ اب نہ تو دہلی اسکول کوئی قابل قدر چیز رہ گیا ہے اور نہ لکھنؤ اسکول جس کو متاخرین نے چوٹی، کنگھی، مسی، جوبن کے مزخرفات سے بدنام کر رکھا تھا، ناسخ نے زبان میں جو انقلاب پیدا کر دیا تھا، اس کو ان کے تلامذہ نے تکمیل تک پہونچا دیا، اب ان کی باقیات محض سعی لاطایل سے کام لے رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ صوبہ اودھ کے مشہور بلاد موہان، مراد آباد، کاکوری، بدایوں، میرٹھ اور اکبر آباد سے ایک جدید اسکول پیدا ہوا جس کو نہ دہلی سے واسطہ ہے اور نہ لکھنؤ سے حالی پر جو عہد حاضر کے نظم نگاروں کے اولین اُستاد ہیں غالب کا کافی اثر تھا لیکن صرف تغزل میں، ان کی نظم نگاری انقلاب زمانہ کی پیداوار ہے، اور یہ فخر اودھ ہی کو حاصل ہوا کہ اس جدید اسکول کی ترقی و سربلندی کا سہرا اسی کے سر رہا[1]۔ حالی کے بعد پنجاب کے فرزند اقبال نے اس کو بہت بڑی ترقی دی، اس پر مغربی ادب و خیال کا اضافہ کیا۔ اب یو۔پی میں جوش، سیماب، دکن میں علی اختر، بہار میں ڈاکٹر عظیم جمیل، شمس، ارمان اس اسکول کو فروغ دے رہے ہیں۔ بہرحال عہد حاضر میں اُردو زبان کے اندر تغزل و نظم نگاری کے اعتبار سے جو انقلاب ہو گیا ہے، اس کو میں محض دہلی اسکول کی طرف منسوب کرنے کے لئے تیار نہیں ہاں صوبۂ اودھ کو فخر کرنا چاہئے کہ اس نے حسرت، فانی، جگر اور جوش پیدا کر کے اپنی انقلاب پسندی کا ثبوت دیا ہے، میں صوبۂ اودھ کے اس دور کی شاعری کو "لکھنؤ اسکول کی انقلابی شاعری" سے تعبیر کرتا ہوں اب آیئے فرداً فرداً اودھ کے ان باکمال شعرا کے کلام پر کسی قدر مفصل تبصرہ کیا جائے

حسرت ۔ حسرت کی شاعری پر نقد و تبصرہ کا حق جلیل احمد قدوائی نے جس بصیرت اور نکتہ رسی کے ساتھ ادا کیا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، اس انتقاد نے خود جلیل صاحب کی زندگی کے بعض نقوش نمایاں کر دئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ذوق سلیم

---

[1] حالی پانی پت کے رہنے والے تھے، یو۔پی یا اودھ سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا، اس لئے جدید اسکول کی ترقی و سربلندی کا سہرا پنجاب کے سر رہا نہ کہ اودھ کے (نیاز)

کے ساتھ جب تک راہ عشق سے آگہی نہ ہو، جلیل صاحب کی طرح کوئی حسرت کی شاعری کے حقایق و نکات کو سمجھ بھی نہیں سکتا یہ اُردو زبان کی خوش نصیبی ہے کہ اسے حسرت جیسا شاعر نصیب ہوا، اور حسرت کو ممنون ہونا چاہیئے جلیل کا جنھوں نے صحیح معنی میں دنیا سے ان کا تعارف کرایا۔ جلیل صاحب کے نقد و تبصرہ کے بعد حسرت کے متعلق کچھ خامہ فرسائی کرنا تحصیل حاصل ہے لیکن آہنگ تسلسل کو قایم رکھنے کے لئے مجبوراً چند سطور لکھنا ہی ہیں

سب سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حسرت کی شاعری کے محرکات کیا ہیں؟ جلیل کی طرح میرا بھی ایمان[1] ہے کہ حسرت کی شاعری کا اولین محرک انکا ولولہ عشق ہے، جسے زمانہ نے ہمیشہ محروم کامرانی رکھا، خود حسرت کا اعتراف ہے

یاد ایام کو ہم جوشِ جنوں میں حسرت — خوار پھرتے تھے پریشان بیابانوں میں

شاعر نے دشت نوردی کی ہو یا نہیں لیکن یہ بالکل حقیقت ہے کہ اس نے شاعرانہ مبالغہ سے کام نہیں لیا، یقیناً وہ میر کی طرح "جوشِ جنوں" کے دور سے گزرے اور اسی عشقبازی نے ان کے اخلاق و کردار پر گہرا اثر ڈالا، فرماتے ہیں:-

گئے عیب سب عشقبازی میں حسرت — نہ بغض و حسد ہے نہ غصہ نہ کینہ

بے اختیار ہمیں اسوقت ظہوری ترشیزی کا یہ شعر یاد آرہا ہے:-

شدہ است سینہ ظہوری پر از محبت یار — برائے کینہ اغیار در دلم جا نیست

حسرت کی شاعری میں نہ کوئی فلسفیانہ پیام ہے، نہ کوئی شاعرانہ معنی آفرینی و نکتہ سنجی بلکہ وہ سیدھے سادے الفاظ میں اپنی کیفیات عشقیہ کو بیان کر دیتے ہیں انھوں نے جس معصومانہ اور پاکبازانہ انداز میں عشقیہ معاملات پر روشنی ڈالی ہے، وہ ہمیں خسرو اور اطالوی شاعری ڈانٹے (Dante) کی یاد دلاتے ہیں، اس میں شک نہیں اسی عشق نے گوئٹے سے "آلام ورتھر" (Sorrows of Werther) لکھوایا اور نواب مرزا شوق سے "زہر عشق"، لیکن گوئٹے اور شوق دونوں کے یہاں غم عشق ولولہ انگیز ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماہرین نفسیات کی تحقیق کے مطابق ان کے عشق کے اندر جذبۂ جنسی (Sexual Instinct) کا غلبہ تھا، اس کے برخلاف خسرو، ڈانٹے اور حسرت ہمیں، محبت افلاطون کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ خسرو کی شاعری بھی تشایم (Romantic) ہے لیکن اس میں میر، ضیا، قایم اور فانی کی قنوطیت نہیں پائی جاتی، کیونکہ ان کے یہاں غم سرمایہ نشاط بن جاتا ہے، اس کے برخلاف خسرو اور حسرت کے یہاں غم و یاس، دل و جگر میں ایک جانکاہ ہوک پیدا کر دیتے ہیں خسرو کا شعر ہے:- شاد باد ات گلستانِ جوانی ہر روز — گرچہ با خسرو از و برگ و نوائے نہ رسید

---

[1] آپ اور جلیل دونوں کا "ایمان" غلط ہو حسرت میں کبھی وہ ولولہ عشق پیدا نہیں ہوا جس کی محرومی و ناکامی ایک شخص کو شاعر بنا سکتی ہے حسرت شاعر پیدا ہوا تھا جو بغیر عشق کے بھی شعر کہہ سکتا تھا حسرت کی شاعری عشق سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ اسکی شاعری نے اُسے عاشق مزاج بنایا۔ فاضل مقالہ نگار نے ثبوت میں جو شعر پیش کیا ہے وہ درست نہیں کیونکہ حسرت بیابانوں میں کبھی خوار نہیں پھرا، زندانوں میں گرفتار ضرور رہا ہے۔ اس نوع کے ادعائے شاعری سے کسی شاعر کی سیرت پر حکم لگانا مناسب نہیں (مدیر)

حسرت فرماتے ہیں :-

آہ وہ یاد کہ جس یاد کو ہو کر مجبور دل مایوس نے مدت سے بھلا رکھا ہے

دونوں شعروں کو پڑھئے اور پھر سوچئے کہ خسرو اور حسرت سپردگی وفتادگی اور حسرت سنجی وناکامی کے اعتبار سے کس قدر ایک دوسرے سے قریب ہیں

حسرت کا دیوان ہمیں بے طرح ڈانٹے (Dante) کی یاد دلاتا ہے، جو بقول اطالوی نقاد ادب میزینی ڈانٹے کے عنفوان شباب کی خوشبو ہے، ڈانٹے نے اپنی زندگی کے اٹھائیسویں برس نظم ونثر دونوں میں "بیٹرس" (Beatrice) کے ساتھ اپنے عشق کا حال لکھا، ڈانٹے نے جہاں پر اپنی محبوبہ کی رحلت کا تذکرہ کیا ہے وہاں طرز وبیان کے اندر ایسی عظمت وکشش پیدا ہوگئی ہے کہ میزینی بول اٹھتا ہے کہ اس کا ترجمہ یا تو صرف شیلی (Shelley) کرسکتا تھا یا پھر عہد حاضر میں اس کا حوصلہ کسی عورت ہی کے دل ودماغ کو ہوسکتا ہے، ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ حسرت کی شاعری میں فلسفیانہ وحکیمانہ پیام نہیں، بلکہ وہ خسرو اور ڈانٹے کی طرح اپنی عشقیہ کیفیات، سوگ اور بروگ کا حال بیان کرتے ہیں، ان کا شعر ہے :-

علم وحکمت کا جنھیں شوق ہو آئیں نہ ادھر کچھ نہیں فلسفۂ عشق میں حیرت کے سوا

اس سلسلہ میں انھوں نے محبت وسرفروشی کے اتنے اسرار ونکتے بیان کئے ہیں کہ رہ عشق کا ایک بے خبر انسان حیرت زدہ ہوکر رہجاتا ہے، میں نے اگلے سطور میں اشارہ کیا تھا کہ حسرت کے عشق میں جوانی کی ہوس رانیوں کو مطلق دخل نہیں انھوں نے بالکل سچ کہا ہے۔

دیار شوق میں ماتم بپا ہے مرگِ حسرت کا وہ وضع پارسا اسکی وہ عشق پاکباز اس کا

اور یہیں سے عشق افلاطونی (Platonic Love) کا سراغ ملتا ہے، عشق افلاطونی کیا ہے؟ ایک پاکباز محبت!، گوشت پوست کی دنیا سے مجرد، ایک معصومانہ تخیل۔ یہاں ایک غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے، میں حسرت کی شاعری کو اسی دنیا کی چیز سمجھتا ہوں، وہ فلسفہ اشراقی (Neo Platonism) کے نفس کل اور وحدت وکثرت ( ) کے مسایل نہیں بیان کرنے لگتے، اور نہ ان کا محبوب ماوراء آب وگل کوئی چیز ہے، بلکہ ان کا معاملۂ عشق اسی دنیا کے ایک پیکر مادی کے ساتھ وابستہ ہے، لیکن اس کے اندر جوانی کی سیہ مستیوں اور جذبۂ جنسی کی داعیات کا پتہ نہیں، ان کے سارے کلام میں ان کی "وضع پارسا" اور "عشق پاکباز" کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں

حسرت نے اپنے کلام میں نسیم، مومن ومیر کے ساتھ اپنی ارادت وعقیدت کا اظہار کیا ہے اور اپنے خیال میں خود کو انکا ہمرنگ بتایا ہے، اس سلسلہ میں ان کے مفصلہ ذیل اشعار قابل ذکر ہیں :-

حسرت تری شگفتہ کلامی پہ آفریں یاد آگئیں نسیم کی رنگیں بیانیاں

حسرت یہ وہ غزل ہے جسے سن کے سب کہیں مومن سے اپنے رنگ کو تو نے ملا دیا

شیرینیٔ نسیم ہے سوز وگداز میر حسرت ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

مگر حسرت صاحب مجھے معاف فرمائیں گے مجھے ان سے اتفاق نہیں اور میرے خیال میں انھیں فارسی شعرا کی روش پر مقطعات میں اس نوع کی شاعرانہ رائے زنی کا حق تو ضرور تھا، خواجہ حافظ، خواجو و ظہیر کی سیادت تسلیم کرتے ہیں۔ رومی:۔ "جاز پئے سنائی و عطار آمدیم" لکھتے ہیں، غالب ظہوری کے تتبع پر نازاں ہیں:۔

غالب بہ شعر کم ز ظہوری نیم و لے — عادل شہ سخن رسد دریا نوال کو

حسرت کو بھی یہ حق حاصل تھا، ان سے کوئی مواخذہ نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حسرت کو نسیم و مومن سے دور کا بھی واسطہ نہیں، اور میر کے نشاط انگیز غم کا حسرت کے یہاں باوجود کوشش بھی پتہ نہیں لگتا، میر کے یہاں غم سرمایہ لذت ہے، اسپر میر کے محاسن شعری مستزاد ہیں۔ میر کا شعر ہے:۔

مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ قلقل نہو دیگا — مے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لیکے رو دیگا

اس نوع کی شاعری کا حسرت کے کلام میں کہیں پتہ نہیں، یا پھر میر کا یہ شعر پڑھئے:۔

قاصد جو واں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا — بیچارہ گریہ ناک و گریباں دریدہ تھا

اس طرح کے تخیل شعری اور شاعرانہ معنی آفرینی سے حسرت کو کوئی لگاؤ نہیں، اور انھوں نے خود اعتراف کیا ہے

شعر میرے بھی ہیں پر درد و لیکن حسرت — میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

ہاں ان کا یہ ادعائے سخن ایک حد تک صحیح ہو سکتا ہے:۔

قایم ہے ترے دم سے طرز سخن قایم — پھر ورنہ کہاں حسرت یہ رنگ غزل خوانی [1]

بعض مستثنیات کے ساتھ میر، ضیا اور قایم ایک ہی سرچشمۂ انوار کی کرنیں ہیں، میر حسن نے قایم کو طالب آملی کا ہمرنگ بتایا ہے یہ بالکل بے جوڑ سی بات ہے، پھر بھی اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، کہ حسرت کے کلام میں میر کا سوز و گداز اور قایم کی سوختہ سامانی دونوں پائی جاتی ہیں۔ اب آیئے ان کے اشعار پر مختصر سا تبصرہ کریں

بھولے سے وہ ادھر بھی جو آ نکلے تھے کہیں — اس دن کا بھولتا ہی نہیں ماجرا مجھے

جلیل صاحب نے بھی مقدمہ میں یہ شعر لکھا۔ اور اس پر اپنے خالص معصومانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے، یہیں سے مجھے سراغ لگا کہ جلیل صاحب بھی حسرت کی طرح "حریف باد پیما" ہیں، حقیقت یہ ہے کہ "انتخاب شعر" سے بھی انسان کبھی "رسوا" ہو جایا کرتا ہے

---

[1] حسرت کا یہ دعویٰ کہ ان کے کلام میں مومن، نسیم اور میر تینوں کا رنگ پایا جاتا ہے بالکل صحیح ہے۔ حیرت ہے کہ عبدالمالک صاحب حسرت کے یہاں مومن کا رنگ نہیں پاتے۔ درانحالیکہ کلام حسرت میں طرز مومن کی مثالیں بہ کثرت ملتی ہیں، اسی طرح نسیم کا رکھ رکھاؤ بھی حسرت کے یہاں بہت پایا جاتا ہے۔ البتہ میر کا رنگ بیشک پھیکا ہے اور وہ بھی لفظی حیثیت سے معنوی حیثیت سے نہیں۔

(نیاز)

جلیل صاحب نے مقدمہ میں حسرت کا یہ شعر بھی دیا ہے :-

ہم سے ہر چند وہ ظاہر میں خفا ہیں لیکن کوشش پرسش حالات چلی جاتی ہے

حسرت نے اس شعر میں جس عاشقانہ احساس و پندار کا اظہار کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے، عشقیہ معاملات کے نکتے انھوں نے اس عمق نظر کے ساتھ بیان کئے ہیں کہ بعض اوقات ہم حیران رہجاتے ہیں اور حسرت کے کشف و کرامت کا اقرار کرنا پڑتا ہے، لیکن کشف و کرامت سے آپ یہ نہ جان لیں کہ میں حسرت کو صوفی صافی سمجھتا ہوں، گو اپنی بلندی اخلاق اور پاس وضع کے لحاظ سے وہ کسی بڑے سے بڑے زاہد شب برگزیدہ سے کم نہیں کیا شعر کہے ہیں :-

نہ بھولے گا وہ وقت رخصت کسی کا مجھے مڑ کے پھر اک نظر دیکھ لینا

وہ شرمائی صورت وہ نیچی نگاہیں وہ بھولے سے انکا ادھر دیکھ لینا

مصر کے مشہور نقاد اور ڈاکٹر زکی مبارک نے، نقد شعر و ادب کے سلسلہ میں "صور شعریہ" کو بڑی اہمیت دی ہے "صور شعریہ" یہ ہے کہ ہم کسی منظر، یا کیفیت کو اس طرح بیان کریں کہ منظر کی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے، یا وہ کیفیت خود ہمارے اندر طاری ہو جائے، حسرت کے اشعار بالا پڑھئے اور غور کیجئے اگر مرقع چغتائی کی طرح کبھی کسی مصور کے موئے قلم نے اس کو نقش کیا تو دیکھنے والوں کا کیا حال ہوگا۔ غالب کا مشہور شعر ہے :-

نگاہ بے محابا چاہتا ہوں ، تغافلہائے تمکیں آزما کیا

حسرت کہتے ہیں :-

ہے وہاں شانِ تغافل کو جفا سے بھی گریز التفات نگہ یار کہاں سے لاؤں ،

الغرض حسرت اپنے ادائے بیان اور شعریت کے اعتبار سے ایک مخصوص انفرادیت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری منطق و مطالعہ کی مرہون منت نہیں بلکہ اس کے اندر محض داخلیت کی کارفرمائیاں ہیں۔

اصغر — اصغر کی شاعری پر کچھ روز ہوئے نگار میں ہمارے محترم حضرت نیاز مدظلہ نے نقد و تبصرہ کیا تھا، میں حضرت موصوف کو محض ادیب و شاعر نہیں جانتا بلکہ میں ان کو عہد حاضر کا سب سے بڑا مفکر اور پیام بر سمجھتا ہوں، ممکن ہے لوگوں کو اس میں فرطِ ارادت کی کارفرمائیاں نظر آئیں اور وہ میری اس "نیاز کیشی" کو (Negative self-feeling) کا نتیجہ سمجھیں، لیکن اس اعتقاد کے لئے میرے پاس دلایل و براہین ہیں جو "نیاز نامہ" کی صورت میں بہت جلد ملک کے سامنے آئیں گے، بہرحال باوجود اس ارادت کے میں ان کا مقلد نہیں اور میں ان کی اصابت رائے کا بیہم تجربہ رکھنے کے باوجود ان کی ہر رائے سے پہلے بلا ذاتی تحقیق کے اتفاق نہیں کرتا حالانکہ میری ذاتی تحقیق و کاوش بھی اکثر و بیشتر اسی نتیجہ پر پہونچاتی ہے، اصغر کے متعلق بھی میں نے ذاتی تحقیق کی اور مجھے صاف گوئی کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس معاملہ میں مجھے حضرت نیاز سے اتفاق نہیں۔

نیاز صاحب اصغر کی شاعری کو بہ حیثیت مجموعی اچھی چیز ضرور سمجھتے ہیں لیکن ان کے صوفیانہ رنگ کو وہ پسند نہیں کرتے،

ان کے نزدیک تغزل کے اندر صوفیانہ افکار کا اختلاط مستحسن نہیں، مجھے یہیں سے نیاز صاحب سے اختلاف ہے، یہ اختلاف ذوق و وجدان کا ہے اس لئے یوں بھی اس کے لئے دلیل و برہان کی ضرورت نہیں، لیکن پھر بھی کچھ کہنا ہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب عورت و محبت، حسن و رنگ، لذت و الم، حیات و موت ہمارے جذبات کے اندر برانگیختگی اور عضلات میں ہنگامہ پیدا کر دیتے ہیں، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ تصوف جو نام ہے ایک پاکباز محبت کا اور کثرت کے اندر وحدت کی جلوہ آرائیوں کا، انسان کے اندر شعر گوئی کی صلاحیت نہ پیدا کر دے، یہی وجہ ہے کہ تصوف، فلسفہ اور شعریت کے امتزاج سے دنیا میں بڑے بڑے شعرا پیدا ہوئے، شوپنہار اور ابن سینا، فلسفہ کے ساتھ شاعری کا بھی بلند ذوق رکھتے تھے

ابن عربی، رومی، میر، درد کی صوفیانہ شاعری، بالخصوص صوفیانہ رنگ تغزل سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، ترجمان الاشواق اور دیوان شمس تبریز ہمیں اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ مادی محرکات عشق نے میر، کیٹس، نظیری اور ابن ابی ربیعہ پیدا کئے تو روحانی محرکات عشق نے بھی اس دنیا میں کچھ کم خدمتیں انجام نہیں دیں، جس طرح تخیلات و تصورات ایک اسکول سے دوسرے اسکول ایک عہد سے دوسرے عہد میں منتقل ہوتے ہیں اسی طرح صوفیانہ شاعری کے تخیلات دوسری صدی ہجری سے برابر شعرائے متاخرین کو اثر پذیر کرتے رہے ہیں۔ درد و غالب دونوں کے کلام پر اس رنگ کا اثر پڑا، دونوں نے ادائے بیان میں مختلف اسلوب اختیار کئے ہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ سنائی و عطار، رومی و عراقی کے کلام میں بے ساختہ پن ہے اور صوفیانہ افکار ان کی شاعری پر نفسیاتی ابتہاجیت کے طور پر چھائے ہوئے ہیں لیکن متاخرین میں صوفیانہ شاعری کے اندر تقلیدی رنگ غالب ہے وہ محسوسات کی دنیا سے الگ ہو کر اصول و ضابطہ کے ماتحت صوفیانہ شاعری کرتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے اشعار فلسفۂ اشراقی کا مسئلہ بن جاتے ہیں، غالب کے یہاں یہ بدعت زیادہ ہے، اصغر نے اسی کی تقلید کی، بہر حال اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ (Suggestibility) کے اندر جہاں کسی کے اندر کسی شخص کی برتری و فوقیت کا احساس ہوتا ہے وہاں "قانون مقارنت" کو بھی بڑا دخل ہے، ہمارے عہد میں بہت بڑے بڑے علماء و ادب موجود ہیں لیکن ہم کسی ایک سے زیادہ اثر پذیر ہوتے ہیں اس کی وجہ وہی ہے کہ اس کے افکار ہمارے نفسیاتی "حال" کے زیادہ مطابق ہیں، اصغر کا بھی یہی حال ہے کہ صوفیانہ شاعری بالخصوص غالب کے تتبع میں انھوں نے اپنے تغزل کی بنیاد تصوف پر رکھی[1]

اب آیئے اس تمہیدی بیان کے بعد اصغر کی شاعری پر بحث کریں، اصغر کی شاعری کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ میرا خیال ہے کہ

---

[1] میرے متعلق اکثر لوگوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ میں شعر میں "رنگِ تصوف" پسند نہیں کرتا اور اسی لئے میں اصغر کی شاعری کا معترف نہیں ہوں۔ تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کا موقع تو یہ نہیں ہے تاہم چونکہ بات "سخن گسترانہ" آ پڑی ہے، اسلئے مختصراً کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔

"تصوف" کا مفہوم دنیا نے جو کچھ قرار دیا ہو، مگر میں اُسے اتنی بلند چیز سمجھتا ہوں کہ اگر ریگزارِ مذہب میں اس کا وجود نہ ہو تو پھر مذہب میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ ریاضی طبیعیات کی طرح کوئی ایسا علم نہیں ہے جو نظریات و اصطلاحات کا محتاج ہو۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۰ پر ملاحظہ ہو)

غالب کی صوفیت اور مومن کی معنویت دونوں کو ملا دیجئے اصغر کی شاعری کا میولی بن جائے گا[1]۔ جس طرح مومن کے اشعار ہمیں دعوت غور و فکر دیتے ہیں اسی طرح اصغر کا کلام بھی ہمیں فوراً لطف اندوز نہیں ہونے دیتا، میر و حسرت کی طرح آپ اس کے کلام کو سنتے ہی

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۹)

وہ بالکل اخلاقی دنیا کی چیز ہے اور اس کا تعلق انسان کے وجدان سے ہے۔ مثلاً یہ محسوس کرنا کہ تمام افراد نوع انسان ایک ہی چیز ہیں، اور ان سب کو باہم گرمجوشی و ہمدردی کی زندگی بسر کرنا چاہئے، یقیناً تصوف ہے، لیکن اس احساس کی صداقت و حقانیت کے ثبوت کے لئے "حیز اصلی مظہر کل، ناہد، اناہد وغیرہ کی اصطلاحات وضع کرنا اور "ذات و صفات" کے جھگڑے پیدا کرنا قطعاً تصوف سے خارج ہے۔ میں شاعری میں وجدانِ تصوف کے آثار و علائم دیکھ کر بہت لطف اندوز ہوتا ہوں لیکن اصطلاحات تصوف کا استعمال میری طبیعت کو مکدر کر دیتا ہے اور میں ایسا محسوس کرنے لگتا ہوں کہ میری وجدانی کیفیت کم ہوتی جا رہی ہے اور ایسا ہونا چاہئے کیونکہ اس صورت میں ذہن معنویت کی طرف سے خارج کی طرف منتقل ہوتا ہے اور شاعری بالکل منطق کا مسئلہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ شاعری میں نعت گوئی سب سے ادنیٰ درجہ کی چیز سمجھی جاتی ہے، لیکن میں اس سے بھی لطف اٹھاتا ہوں اگر واقعی کوئی کیفیت اس میں پائی جائے۔ صمد الہ آبادی کا شعر ہے:۔

او مدینہ میں خدائی کے بلانے والے
منتظر اور بھی دو چار ہیں آنے والے

میں اس شعر کو تمام کلیات محسن پر ترجیح دیتا ہوں، کیونکہ اس میں صرف جذبات ہیں اور یہاں سوائے تکلفات شاعری کے اور کچھ نہیں۔ شہیدی کا ایک شعر تصوف کے رنگ میں ملاحظہ ہو:۔

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

اس کے مقابلہ میں غالب کے اس شعر کو پڑھئے:۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اور خود فیصلہ کیجئے کہ ان میں کونسا شعر اپنا اثر چھوڑ جاتا ہے۔

میں شعر میں تصوف کا رنگ بہت پسند کرتا ہوں، لیکن صرف اسی حد تک کہ شعر کی شعریت باقی رہے اور ہمارے وجدان کو اصطلاحات تصوف میں الجھا کر تباہ نہ کیا جائے اصغر کے یہاں تصوف کا رنگ اکثر و بیشتر یہی ثقیل صورت اختیار کر لیتا ہے، اور اسی لئے میں اسے پسند نہیں کرتا۔ (نیاز)

[1] مجھے اس تجزیہ سے اختلاف ہے۔ مومن کی تو اصغر کو ہوا بھی نہ لگی تھی اور غالب کے تصوف سے بھی انھیں کوئی واسطہ نہ تھا، اصغر کی شاعری کے اجزائے ترکیبی میری رائے میں تین ہیں، غالب کی دقت پسندی، اقبال کی گہرائی اور خود انکا ذاتی "صوفی پن"۔ سو اپنی کم علمی کی وجہ سے وہ غالب و اقبال کے رنگ کو تو نبا نہ سکے، رہ گئی ان کی "صوفیت" سو چونکہ وہ بھی اصطلاحی قسم کی مستعار صوفیت تھی، اس لئے "شاہد و مشہود" کے خشک استدلالات سے آگے نہ بڑھ سکی
اصغر بہت ذہین شخص تھے اور فطرت کی طرف سے انھیں سوچنے کا اچھا سلیقہ عطا ہوا تھا، لیکن افسوس ہے کہ مافی الضمیر کے اظہار کے لئے انکو مناسب الفاظ نہ ملتے تھے۔ لیکن اگر کسی جگہ وہ اس میں کامیاب ہو گئے ہیں تو اس میں شک نہیں کہ بے مثل شعر کہہ گئے ہیں۔ (نیاز)

سر دھننے لگیں ممکن نہیں، یہ شعر گوئی اچھی ہے یا بری یہ طبایع کے ذوق و وجدان اور امعان نظر پر موقوف ہے نیاز صاحب جب مومن کی شاعری کو پسند کرتے ہیں، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اصغر کی یہ دقت پسندی ان کو ناگوار گزرے[1]۔

اصغر غالب کے صوفیانہ افکار سے پوری طرح اثر پذیر ہیں، "سرسپرد" نے اصغر کے کلام پر نہایت بصیرت افروز طریقہ سے روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں :۔

> حکیمانہ خیالات کو جن میں جذبات کی شدت و لطافت بھی ہو، شعریت کے رنگین و پر کیف لباس میں پیش کرنا جناب اصغر کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جسے ان کے ہر ناقد نے تسلیم کیا۔ (مقدمہ "سرود زندگی" ص ۸)

موصوف کی رائے اپنی جگہ پر بالکل قطعی ہے، اصغر کہتے ہیں :۔

میں ہوں ازل سے گرم رو عرصۂ وجود — میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے

اس شعر کے پڑھنے کے بعد ہم کسی قدر سوچ میں پڑ جاتے ہیں کیا واقعۃً اصغر نے جو تخیل اپنے شعر میں پیش کیا ہے اس پر ان کا اعتقاد بھی تھا، اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو ان کے شعر سے فلسفہ کا ایک خاص مسلک ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

جرمنی کے شہرۂ آفاق فلسفی "ہیگل" کی طرح اسی سرزمین کا ایک اور مفکر ہیکل (Haeckel) گزرا ہے وہ کہتا ہے کہ حدوث کے سوا، کوئی شے مستقل و پایدار نہیں، صرف "جوہر" قدیم اور ناتغیر پذیر ہے، خواہ ہم اس جوہر کو فطرت یا ہیولیٰ سے تعبیر کریں یا خدا یا روح عالم سے "جوہر" کا قانون ہمیں سکھاتا ہے کہ وہ ہمارے سامنے لامتناہی انواع و اقسام کی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کی مخصوص صفات مادہ اور قوت مستقل ہیں، جوہر کے تمام انفرادی اشکال و صور برباد ہو جانے والے ہیں اصغر نے بھی ہستی کی گرم روی کا جو فلسفہ بیان کیا ہے وہ ہیکل سے ملتا جلتا ہے[2]

اصغر کے کلام پر غالب کا کافی اثر ہے، انکے بعض خیالات، صوفیہ (بالخصوص رومی) کے افکار سے اثر پذیر معلوم ہوتے ہیں، ملاحظہ ہو

نظام دہر کیا بیتابیوں کے کچھ مظاہر ہیں — گداز عشق گویا روح ہے اجزائے عالم کی

شعاع مہر خود بیتاب ہے جذب محبت سے — حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پرواز شبنم کی

اس سلسلہ میں رومی کی وہ غزل پڑھئے جس کے دو شعر یہ ہیں :۔

تن من چو ماہ ماند کہ ز عشق می گداز د، — دل من چو زنگ زہرہ کہ گسستہ دار بادا

بہ گداز ماہ منگر بہ گسستگی زہرہ — تو حلاوت غمش بیں کہ یکے ہزار بادا

اصغر فرماتے ہیں کہ " نظام دہر جسے تم کہتے ہو، وہ کوئی نظام ہے تھوڑا ہی، دہر ایک تماشا گاہ بیتابی ہے، عالم کے اجزائے ترکیبی ہی ہیں

---

[1] کجا مومن کی دقت آفرینی اور کجا اصغر کی اہمال پسندی، مومن "محذوفات" سے فنی اشارے (Artistic suggestion) پیدا کرتا ہے اور اصغر "زواید" سے مفہوم کو مسخ اور انداز بیان کو غیر شاعرانہ بنا دیتے ہیں "وشتان بین خل و خمر" شراب و سرکہ میں کچھ تو فرق کرنا چاہئے

[2] اسی قسم کے مباحث شعر کو مکروہ بنا دیتے ہیں اور تصوف کا یہی وہ پہلو ہے جس نے تصوف کو لغو و بیکار کر دیا۔ (نیاز)

عشق کی گھلاوٹ ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ آفتاب بھی کشش عشق کی بنا پر شبنم کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، ورنہ بیچاری شبنم میں جو اڑنے کی طاقت ہے وہ ہمیں اور آپ کو معلوم ہی ہے، رومی کہتے ہیں کہ میرا جسم عشق سے اسی طرح گھلا جا رہا ہے جس طرح چاند گھل گھلکر گھٹتا ہے، اور میرا دل چنگ زہرہ کی طرح گسستہ تار ہے پھر فرماتے ہیں کہ چاند کی گھلاوٹ اور زہرہ کی گسستہ تاری پر نہ جاؤ، بلکہ انکی حلاوت غم پر غور کرو، کہ جس نے ایک شے کے مختلف اجزا کر دئے،، اصغر نے جہاں فلسفیانہ اشارات اور صوفیانہ رموز نہیں پیش کئے، وہاں ان کے کلام میں اور زیادہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے، فرماتے ہیں :۔

بہائے درد والم درد و غم کی لذت ہے — وہ ننگ عشق ہے جو آہ ہو، اثر کے لئے

ان کا یہ شعر مجھے بیحد پسند ہے :۔

نہ میں دیوانہ ہوں اصغر نہ مجھ کو شوق عریانی — کوئی کھینچے لئے جاتا ہو خود جیب و گریباں کو

"جیب و گریباں" پر کسی صاحب نے اعتراض کیا تھا جس کا جواب نیاز صاحب نے دیدیا ہے

جگر - جگر کا کلام "شعلۂ طور" کے نام سے میرے پیش نظر ہے، اس کی ورق گردانی کرنے کے بعد جو عجیب و غریب چیز نظر آئی وہ جناب سید سلیمان ندوی کا تعارف ہے، سید سلیمان صاحب میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں بعض خطرناک یا تکلیف دہ قسم کی کمزوریاں بھی ہیں، سید صاحب اپنے اُستاد مولانا شبلی کی طرح علم و ادب کے ہر شعبہ پر کچھ نہ کچھ اپنا تصرف ثابت کرنا چاہتے ہیں شبلی مرحوم تو ( ) تھے، نباہ لے گئے، ہر چند اس زمانہ میں مشکل ہی سے ان کی کوئی تصنیف ہوگی جو محققین کی ایراد و اعتراض سے پاک ہو، ان کے حواریین کہہ سکتے ہیں اعتراض تو قرآن پر بھی ہوتا ہے، لیکن میں کہوں گا کہ ایسا اعتراض نہیں بلکہ المبرد کی طرح جس نے ابو نواس کے چند شعر پر اعتراض کیا تھا اور جسے اس نے اپنی کتاب العقد میں درج کیا ہے۔ ابن خلکان وفیات الاعیان میں اپنا ایک خواب لکھتے ہیں، جس میں المبرد ظاہر ہوتا ہے اور آپ معترضین کے اقوال نقل کرتے ہیں، ابو نواس کے سلسلہ میں اس کی ایراد پر جو لوگوں نے کئے ہیں، وہ خواب میں بھی اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہے، شبلی مرحوم اگر زندہ ہوتے، تو ان کو سیرۃ النبی، سیرۃ النعمان، شعر العجم کی خامیاں اور غلطیاں ماننا ہی پڑتیں۔ مگر ہمارے سید صاحب کہ قدرت کی طرف سے شبلی جیسا ذہن بھی نہیں لیکر آئے ہیں اس پر آپ کی یہ اپج حد درجہ حیرت انگیز ہے، انسان بھی ذوق نمود سے بعض اوقات کس حد تک مجبور ہو جاتا ہے۔ نتیجہ وہی ہوا، کہ ارض القرآن، سے لیکر آپ کی کل تصنیفات پر لوگوں نے اعتراضات کی بھرمار کر دی اور آج تک آپ کسی کا شافی جواب نہ دے سکے، ممکن ہے کسی کا جواب دیا ہو، میری نظر سے نہیں گزرا، بہر حال "شعلۂ طور" کا تعارف بھی سید صاحب کی اس جابرانہ تصرفات کی قسم کی چیز ہے، اس سے پہلے جناب نیاز صاحب نے "نگار" میں آپ کے ذوق شعری پر تبصرہ کیا تھا، ابھی تک آپ کا وہ مقدمہ داغ جگر نظر سے نہیں گزرا، میں آج تک سمجھے بیٹھا تھا کہ نیاز صاحب نے سنجیدہ شوخی کی، اور کبھی کبھی فرط ہیجان میں وہ ایسا کر بیٹھتے ہیں گو جب وہ شوخ سنجیدگی پر اُتر آتے ہیں تو اپنی مثال نہیں رکھتے۔

سید صاحب کا "تعارف" پڑھنے کے بعد میں دنگ رہ گیا، کیونکہ آج تک مجھے صرف یہ خبر تھی کہ لوگ ان کی علمی تحقیقات

اور ادبی ذوق کے منکر ہیں میرے اندر کبھی بھولے سے بھی یہ بدعقیدگی نہیں پیدا ہوئی کہ سید صاحب کے اخلاق و سلوک کی طرف سے بھی کبھی شک وارتیاب ہو سکتا ہے، مگر میں نے "شعلۂ طور" میں "تعارف" کے یہ چند سطور پڑھے تو آپ یقین مانئے کہ خلاف معمول میری طبیعت میں سخت قسم کی برہمی پیدا ہوئی آپ فرماتے ہیں:۔

اسوقت حاضرین میں مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبدالسلام صاحب ندوی اور دوسرے کمرے میں جہاں آواز جا سکتی تھی، پروفیسر عبدالباری صاحب ندوی تھے اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر سخن فہمی کا مدعی اور موجودہ شعرا کے عیب و ہنر سے واقف، ان عنایت فرما کے اس تعارف نے گدگدی پیدا کی اور جی چاہا کہ شاعر صاحب سے کچھ سنا جائے اور ان کے اس دعوائے سخنوری کا امتحان لیا جائے، سب کی نظریں ایک خاص نگاہ تبسم کے ساتھ شاعر کے چہرے کی طرف اٹھیں، مگر اس نے اس ماحول سے بے پروا ہو کر ایک عجیب درد انگیز ترنم مست لہجے اور سرشار انداز میں ایک غزل کا ترانہ چھیڑا، ایک دو شعر پڑھے تھے کہ سب کو سنبھل جانا پڑا، ذہن کی رو کو ظرافت سے متانت کی طرف پھیرنا پڑا تبسم کی نگاہ میں تحیر ہوا۔ (شعلۂ طور ص ۲-۳)

میں نہیں کہہ سکتا مولویانہ بطون کی اس سے بڑھکر کوئی افسوسناک تشہیر ہو سکتی ہے، میں پوچھتا ہوں، یہ نو وارد شاعر جگر تھے، انھوں نے شبلی ہال کے دنگل میں سب کو پچھاڑ دیا، اگر کوئی معمولی درجہ کا انسان ہوتا، تو کیا آپ لوگ اپنے زعم کمال میں اسی طرح کنکھیاں چلاتے، اسی طرح پھبتیاں کرتے، یہ حال ہے اس جماعت کا جو جلوۂ محراب و منبر کے وقت رو رو کر "ان الذین اجرموا کانو من الذین آمنوا یضحکون و اذا مروا بہم یتغامزون و اذا نقلبوا الی اہلہم انقلبوا فکہین" کا وعظ کہا کرتی ہے جو اپنے ظاہری تقدس اور مصنوعی ریزش جبیں کے صلہ میں قوم سے دست بوسیوں کی طلبگار رہے ؎

گر نبید بر اں دیدہ کاینجا نہ شود گریاں

آپ ہی جیسے حضرات کی کرامت نے تو علما کی شان برقرار رکھی ہے، سچ ہے صومعہ سے نکلکر جب کوئی مولوی صنمخانہ، اور میکدہ میں پہونچتا ہے، تو اس کی گرم نگاہیاں اور دست درازیاں بڑے سے بڑے کہنہ مشق شاہد بازوں، اور بلانوش میخواروں کو بھی شرما دیتی ہیں۔ اسی "تعارف" کے سلسلہ میں ہمارے مولانا فرماتے ہیں:۔

"آخر اعظم گڈھ اور شبلی منزل کی یہی تحسین و آفرین تھی، جو داغ جگر کی دل پذیر شکل میں ملک کے سامنے آئی اور سب نے جگر کو جگر جانا" میں اس پر صرف اس جملہ کا اضافہ کر دینا چاہتا ہوں کہ شبلی منزل کی اس جگر نوازی کی اشاعت میں حضرت نیاز نے بھی بہت بڑا حصہ لیا ورنہ دنیا جگر کے محاسن شعری کا احساس تو کبھی نہ کبھی ضرور کرتی مگر شبلی ہال کا ذوق سخن فہمی پردۂ کتمان ہی میں رہجاتا۔ سید صاحب جگر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"جگر مست ازل ہے اس کا دل سرشار الست ہے، وہ محبت کا متوالا اور عشق حقیقی کا جویا، وہ مجاز کی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور بتخانے کی گلی سے کعبے کی شاہراہ کو اور خمخانہ کے بادۂ کیف سے خود فراموش ہو کر بزم ساقی کو شرمناک پہونچنا چاہتا ہے"

جی ہاں، مولانا سچ کہا وہ تو جگر نے خود ہی فرمایا ہے:۔

قدم ڈگمگائے نظر بہکی بہکی جوانی کا عالم ہے سرشاریاں ہیں

اسوقت مجھے جناب نیاز کے یہ جملے بے طرح یاد آرہے ہیں کہ "جگر کی شاعری پر نقد و تبصرہ کرنے سے سید سلیمان ندوی کا مقصود یہ کچھ تھوڑا ہی تھا کہ جگر کے محاسن شعری پر روشنی ڈالی جائے، بلکہ خیال یہ تھا، کہ اپنے ذوق سخن فہمی پر مہر توثیق ثبت کردیجائے" اور میرے خیال میں سید صاحب نے یہ کر ڈالا، "فبای حدیث بعدہٗ یومنون" ۔ اب آیئے جگر کی شاعری پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے، یہ تو ظاہر ہے کہ جگر نے اصغر کی تربیت و اصلاح سے استفادہ کیا جس کا اعتراف خود انھوں نے شعلۂ طور میں کیا ہے، جگر گے بہت سے اشعار میں اُستاد کے رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے، لیکن ہر جگہ جگر کی انفرادیت بھی قایم ہے، جگر نے اصغر کی طرح غالب و مومن کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے بعض اشعار سے جگر کے کلام کا توارد ہوگیا، جگر کا شعر ہے:-

عشق کو مطمئن نہ رکھ حسن کے اعتماد پر وہ تجھے آزما چکا تو اسے آزمائے جا

غالب کا مشہور شعر ہے:-

حسن اور اپنے حسن ظن رہگئی بولہوس کی شرم اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

دونوں شعر ایک ہی مرکزی تخیل کے پرتو ہیں۔

مومن کہتے ہیں:-

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا ،، جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

جگر کا شعر ہے:-

وہ ہمارے قریب ہوتے ہیں جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب و مومن کے مطالعہ نے جگر کے تخیل پر اپنے کافی نقوش چھوڑے ہیں، اس حد تک کہ بعض اوقات وہ غیر شعوری طور پر ان کے کلام کو اپنا کلام سمجھنے لگتے ہیں۔

سید سلیمان ندوی صاحب نے "تعارف" میں ضمناً حافظ، خیام اور ابن یمین کا نام لیا ہے، لیکن یہ نہیں لکھا کہ اُردو میں حافظ کے رنگ کا کوئی شاعر ہوسکتا ہے تو وہ جگر ہے، وہی سرشاری، وہی سرخوشی، وہی رنگینی، وشاہد بازی جس پر تصوف کا دھوکہ ہوجائے، جگر کے یہاں بھی ہیں، خواجہ حافظ کی شاعری نشاط و ابتہاج، رجائیت و تفاول (Optimism) کی شاعری ہے، ان کے یہاں آرزو و تمنا کی ربوبیت، بدرجۂ اتم ہے، یہاں تک کہ جب وہ اپنے شاہد کو "حبیب بادہ پیما" کے ساتھ بادہ نوشی کے لئے مستعد پاتے ہیں تو بھی "بیا د آر حریفان بادپیمارا" کہہ بیٹھتے ہیں جو رجائیت کی انتہا ہے۔

جگر کی غزلیں پڑھنے والے کے دل و دماغ پر ایک کیف و سرمستی پیدا کردیتی ہیں، ان کی بعض غزلیں جو بحر طویل میں ہیں حد درجہ اثر آفریں ہیں، ان کا شعر ہے:-

عجب انقلاب زمانہ ہے مرا مختصر سا فسانہ ہے یہی اب جو بار ہے دوش پر یہی سر تھا زانوئے یار پر

پوری غزل پڑھ جایئے، اس کا ہر شعر ایک کیفیت و اثر میں ڈوبا ہوا ہے، اسی طرح ان کی وہ غزل بھی بہت دلآویز ہے جس کا مطلع یہ ہے:۔

اے حال و قال سے واسطہ نہ غرض مقام و قیام سے — جسے کوئی نسبت خاص ہو ترے حسن برق خرام سے

فانی ۔۔ جس طرح شبلی اپنے عہد بلکہ اپنی صدی کے سب سے بڑے غزل گو کی حیثیت سے ہمیں میر سے قریب نظر آتا ہے، اسی طرح فانی اسکاٹ لینڈ کے مشہور ترین غزل گو رابرٹ برنس کے مثل معلوم ہوتے ہیں، اہل نظر ان کو عہد حاضر کا میر کہتے ہیں میرا خیال ہے ضیا اور فانی اور بڑی حد تک قایم میں بھی میر ہی کا سوز و گداز پایا جاتا ہے، ضیا تو بقول مصحفی، میر کے شاگرد ہی تھے۔ (تذکرہ ہندی گویان ذکر ضیا) فانی۔ کے اندر میر کی شاعرانہ رفعت خیال تو نہیں لیکن والہانہ جذبات وہی ہیں، میر ہی کی طرح ان کے یہاں بھی غم سرمایہ نشاط بن جاتا ہے، فانی کے مشہور اشعار ہیں:۔

چلے بھی آؤ یہ ہے قبر فانی دیکھتے جاؤ — تم اپنے مرنے والوں کی نشانی دیکھتے جاؤ

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے — کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

حسرت اور فانی میں فرق یہ ہے کہ حسرت کی غمناکیوں کے اندر ایک جانگداز کیفیت ہے اس کے برعکس فانی کے یہاں غم میں بھی ایک ولولہ ہے، وہ اس سے بھی ایک لذت انگیز کیفیت حاصل کرتے ہیں، فانی کا دوسرا شعر غالب کے اس خیال سے ملجاتا ہے

زمن بہ جرم تپیدن کنارہ می کردی — بیا بہ خاک من و آرمیدنم بنگر

یہ فخر صرف یو۔پی کو حاصل ہے کہ ہندوستانی ادب اور مسلمانوں کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کرنے کی خدمت اسی سرزمین کے ہونہار فرزندوں نے انجام دی۔ گو حالی نے اردو ادب میں ایک نئی زندگی پیدا کردی اور انہی کا مسدس اردو ادب کا ایک غیر فانی شاہکار ہے لیکن اسمٰعیل میرٹھی نے بھی کم خدمت نہیں کی ہے۔ ان کی اخلاقی، قومی اور اصلاحی نظموں اور اکبر کی شوخ تنقیدوں نے نہ صرف مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں ایک عالمگیر آگہی و بیداری پیدا کردی بلکہ وہ اقبال، جوش، سیماب، جیسے باقیات صالحات بھی چھوڑ گئے جنھوں نے ان کے مشن کو ترقی دی اور نہیں کہا جاسکتا ارتقاء کا یہ سلسلہ کس سطح پر جاکر تمام ہوگا ۔۔ یہ بات لطف سے خالی نہیں کہ اردو ادب کی اس نئی صنف کو ترقی دینے میں یو۔پی ہی کے نوجوانوں اور پختہ کاروں نے زیادہ حصہ لیا، گو اردو نظم کے بانی مولانا حالی پنجاب کے رہنے والے تھے لیکن اسمٰعیل، جوش، سیماب اور احسان کا وطن یو۔پی ہی ہے۔

جوش نے تغزل کی طرف سے گویا منہ موڑ لیا ہر چند ان کی کتاب "شعلہ و شبنم" میں ان کی قدیم غزلوں کے ساتھ جدید غزلیں بھی چھپی ہیں، اب انھوں نے نظم نگاری ہی کو اپنا طرۂ امتیاز بنالیا اس صنف پر ان کی قابل قدر کتابیں "نقش و نگار" "شعلہ و شبنم" اور "فکر و نشاط" وغیرہ شایع ہوچکی ہیں ان کے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ حالی نے اردو ادب میں جس صنف کی داغ بیل ڈالی تھی، اور جسے اقبال نے مغربی ادب کے امتزاج سے چمکایا، جوش بھی اسی نہج کی آبیاری کر رہے ہیں، اس میں

شک نہیں جوش ابھی حکیمانہ ارشاد و پیام کے لحاظ سے اقبال کی سطح سے بہت نیچے ہیں اقبال نے یورپ جاکر اس صنف کا گہرا مطالعہ کیا اور جرمن اور انگریز شعرا سے کافی طور پر استفادہ کیا، اقبال اپنی علمی استعداد کے اعتبار سے انگریز شاعر گولڈ سمتھ اور ندرت فکر کے اعتبار سے گوئٹے کی ہمنوائی کرتے ہیں پھر بھی اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ جوش کی نظموں میں اقبال سے زیادہ ادبی شگفتگی اور کشش پائی جاتی ہے۔ الغرض اقبال کے بعد نظم نگاروں میں اول درجہ جوش ہی کا ہے ان کی کتاب "شعلہ و شبنم" بہت سی اخلاقی اور قومی نظموں کی حامل ہے، شعلہ و شبنم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بائرن (Byron) سے بہت قریب ہیں، بائرن کی ہنگامہ زائیوں نے اسے عرفی کی طرح وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا میزینی (Magini) کا بیان ہے کہ قریب تھا کہ یورپ سے اسکو نکالا جائے، جوش کی نظمیں "نازک اندامان کالج سے خطاب" اور "ذاکر سے خطاب" اسی نوع کی چیزیں ہیں

جوش کے بعد سیماب کے کارنامے نظر آتے ہیں آپ کی کتابیں "کلیم عجم" اور "کارامروز" چھپ کر شایع ہو چکی ہیں، اقبال کی طرح داغ ہی سے تلمذ حاصل ہے۔

سیماب کی کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں تخلیقی (Reproductive) سے زیادہ (Reproductive) رجحان کا غلبہ ہے "کلیم عجم" اور "کارامروز" میں ان کی بہت سی نظمیں ہیں لیکن انہیں بیشتر تقلیدی رنگ پایا جاتا ہے، آپ کی ایک نظم گوتم بودھ پر ہے اس میں فرماتے ہیں:-

روشنی جس کی نہ ہو گی ماند وہ مشعل ہے تو سرزمین ہند کا عرفانی اول ہے تو (کارامروز)

پہلے تو "عرفانی اول" کی ترکیب ہی کچھ غیر مانوس سی ہے، اس کے علاوہ آپ کا یہ دعویٰ بھی واقعات کے اعتبار سے صحیح نہیں گوتم بودھ سے پہلے جین مذہب کے ۲۴ "فری تھنکر" پیدا ہو چکے ہیں اور یہ سب بہت بڑے زاہد متاس اور عارف باللہ گزرے ہیں خود گوتم بودھ کے معاصر مہاویر جی جن کا مولد صوبہ بہار کا ایک مقام "کنڈگام" ہے "بودھ" سے زیادہ معمر تھے، اور گوتم سے پہلے مرے[1] سیماب صاحب نے "مولد غالب" پر ایک نظم لکھی ہے، فرماتے ہیں

مولد غالب کی یہ ویرانیاں مٹ جائیں گی نغمۂ سیماب اس پر زندگی برسائے گا (کارامروز ص ۲۳۳)

ویرانیوں کا مٹ جانا کچھ عجیب سی بات ہے[2] آثار باقیہ البتہ مٹا کرتے ہیں، اس سے مقصود یہ نہیں کہ میں سیماب کی شاعری پر ایراد کروں بلکہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ شاعری سے زیادہ جس کا وہ عہد ثبوت سے خود کو شیفتہ بتاتے ہیں نثر نگاری ان کو زندگی میں کامیاب بناتی اور وہ مفید تر خدمتیں انجام دے سکتے، ان کے ادبی خطبے جو انھوں نے ہندوستان کے مختلف طول و عرض میں شرکت مشاعرہ کی تقریب میں پڑھے ہیں، نظموں سے زیادہ مفید ہیں، بالخصوص وہ خطبے جو انھوں نے مشاعرہ بزم ادب جہلم اور نائی منڈی آگرہ میں پڑھے۔

(کلیم عجم ص ۱۴۱-۱۵۵- اور ص ۱۶۱-۱۷۱)

---

[1] مرتبہ فارلنگ The comparative study of Religion

[2] کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ شاعر کا مقصود یہی ظاہر کرنا ہے کہ میں اپنے نغمے سے اس کی ویرانیاں مٹا دوں گا (نیاز)

ابھی تک تو "جدید لکھنؤ اسکول" کی شاعری پر انفرادی حیثیت سے بحث کی گئی ہے، اب آیئے قدیم لکھنؤ اسکول کی اُس خصوصیت پر بھی ایک طائرانہ نگاہ ڈال لی جائے جس نے بہیئت مجموعی ایک مخصوص رنگ اختیار کیا اور جس کے علمبرداروں میں بعض ہماری نظروں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گئے اور کچھ تبرکات کی حیثیت سے ابھی قایم ہیں، جس طرح دہلی اسکول غالب اور مومن کے بعد فنا ہو گیا اور باوجودیکہ خاندان مومن میں نسیم خاندان غالب میں حالی اور خاندان ذوق میں داغ ہوئے لیکن انھوں نے اپنے اپنے اُستادوں کی شاہراہ سے الگ ہٹ کر شاعری شروع کی: اسی طرح لکھنؤ اسکول بھی خاندان ناسخ کے نام لیوا سید ضامن علی جلال اور خاندان اسیر کے چشم و چراغ امیر مینائی پر ختم ہو گیا اور اس کے بعد لکھنؤ اسکول میں عزیز، ریاض، صفی، صفدر نوح، اثر، ہوئے اور سب نے بہ استثنائے حضرت نوح مختلف راہیں اختیار کیں، عرصہ ہوا آرہ میں ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا تھا، دہلی، اودھ اور بہار کے بڑے بڑے شعرا تشریف لائے تھے، میرے بچپن کا زمانہ تھا، صفدر اور نوح بھی رونق افروز بزم تھے، حضرت نوح نے اپنا کلام سنایا اس کے نقوش اس قدر گہرے تھے کہ اب بھی وہ نقشہ اور سماں پیش نظر ہے، اس کے بعد کبھی نوح کا کلام ان کی زبانی سننے کا اتفاق نہ ہوا، آپ کے کلام میں قدیم لکھنؤ کی شاعری کا پورا اثر ہے، اُسوقت بھی مینے یہی محسوس کیا کہ آپ نے صناع لفظی سے زیادہ کام لیا تھا، اور اب بھی میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا ہے، ریاض پر داغ کا کافی اثر ہے، ان کی خمریات کے مطالعہ سے بے اختیار ——— ابونواس کی یاد آتی ہے، ان کی طبیعت کی رنگینی اور شباب نما سرمستی دل کے اندر غیر معمولی ابتہاج، و ہیجان پیدا کر دیتی ہے، عہد پیری میں ان کے کلام کے اندر اتنی شوخی تھی کہ ان کے بوڑھاپے پر جوانی کا دھوکا ہوتا ہے، فرماتے ہیں:-

ہم تو بس اس ادا پہ مرتے ہیں — منھ چھپائے جو کوستا جائے

اور یہ چھیڑ یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس پر طرہ یہ ہے:-

کوئی منھ چوم لیگا اس نہیں پر — شکن رہجائے گی یونہی جبیں پر

آپ کا ایک شعر ہے، اس کا تیور، اور انداز بیان قابل دید ہے:-

بڑے پاک باطن بڑے صاف طینت — ریاض آپ کو کچھ نہیں جانتے ہیں

الغرض، جرأت، داغ، ریاض زندگی کو ابیقورین فلسفہ کی طرح عیش و خرمی میں بسر کر دینا اپنا نصب العین سمجھتے تھے یہ شوخی، لذت و نشاط صاف بتا رہی ہے کہ ان کی طبیعت کا اُٹھان ہی ایسا تھا کہ وہ زندگی کو ہنسی اور ٹھٹھول کے سوا کسی سوگ و بروگ میں ضایع کرنا نہیں چاہتے تھے، بعض انسان طبعاً نشاط پسند ہوتے ہیں ریاض بھی انھیں لوگوں میں تھے

چند ماہ گزرے پوجا کی تعطیل میں جب میں پہلے پہل لکھنؤ آیا، تو یہاں کے بعض بزرگوں سے نیاز حاصل کیا، اسی سلسلہ میں حضرت صفی کے دولتکدہ پر بھی حاضری دی، آپ وضع قطع، اخلاق، و طرز انداز بیان، الغرض اپنے صوری و معنوی خصوصیات کے لحاظ سے قدیم لکھنؤ کی تہذیب و شایستگی، کی باقیات میں سے ہیں، آپ سے درخواست

کی گئی کہ اپنے کلام سے فیض یاب فرمائیں، آپ نے بزرگانہ محبت کے تبسم کے ساتھ اسے قبول فرمایا اور اپنی ایک غزل پڑھی سنکر میں بڑی دیر تک سوچتا رہا کہ تذکروں میں لکھنؤ اسکول کی شاعری اور لکھنؤ کے شعراء کے کلام کا جو حصہ نظر سے گزرا ہے اس سے ہٹکر یہ دوسری چیز معلوم ہوتی ہے۔ میں آرہ واپس آیا، لیکن قیام لکھنؤ کے بعض تصورات مہینوں دل و دماغ پر مسلط رہے ان میں امید امیٹھوی کا فسانۂ غم اور حضرت صفی کی غزل کا ایک شعر بھی تھا، جب کبھی غم روزگار سے فرصت ملتی تو صفی کا وہ شعر جس کا صرف اب ایک مصرعہ یاد رہگیا، "بلبل کی طرح نالہ یا اشک بہانا ہے" گنگناتا اور سر دھنتا، صفی نے اس شعر میں یہ پیام دیا ہے کہ "اس منزل ہستی میں انسان کو چین کہاں نصیب، اس کی قسمت میں تو بلبل کی طرح نالہ کرنا یا شمع کی طرح اشک بہانا لکھا ہے"، حضرت نے اپنی بعض تالیفات کا تذکرہ کیا جن میں ایک "تنظیم حیات" ہے اور بعض دوسری غیر مطبوعہ تصنیفات کا حال بیان فرمایا، الغرض میں آپ کی شاعری اور اخلاق دونوں سے بہت متاثر ہوا۔

یہاں تک تو تصویر کا ایک رخ تھا، لیکن اس کے دوسرے رخ پر اسوقت نظر پڑی جب میں لکھنؤ آیا انجمن بہار ادب کے ارکان و منصب داروں کی علمی سرگرمیاں دیکھیں اور بزم مشاعرہ میں شعرائے لکھنؤ کا کلام سنا، میں نے اس سے قبل جو کچھ لکھا تھا اس کا ماخذ مطبوعہ کتابیں تھیں، تذکرے تھے، اور بعض سنی سنائی روایتیں، لیکن لکھنؤ میں آکر ایک دوسری دنیا نظر آئی، جو حد درجہ دلچسپ بھی تھی اور حیرت زا بھی، یقیناً میں نے عہد حاضر کے لکھنؤ اسکول کے متعلق جو کچھ لکھا تھا وہ بالکل سنگین حقیقت ہے اور خاص لکھنؤ والے اپنے تخیل کدہ کے کتنے ہی عجیب و غریب نقوش کیوں نہ پیش کریں، میری رائے میں ترمیم نہیں ہو سکتی

میں نے اپنے مقالہ میں لکھنؤ اسکول کی جدید شاعری کا معیار حسرت، اصغر، جگر، فانی، جوش، سیماب، صفی، اثر، آرزو کے کلام کے مطالعہ کی بنا پر قیام کیا تھا، یقیناً ان حضرات نے قدیم لکھنؤ اسکول کی روش سے ہٹکر غزلیں اور نظمیں لکھیں، بعض حضرات کو شکوک ہوں گے کہ حسرت، اصغر، جگر، فانی، سیماب وغیرہ کو دہلی اسکول کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ان کے کلام میں دہلی اسکول کا رنگ پایا جاتا ہے اور انھوں نے دہلوی اساتذہ سے اصلاحیں لیں، حسرت نے نسیم دہلوی و مومن سے عقیدت کا اظہار کیا ہے سیماب خود داغ کے شاگرد تھے، اس کا جواب یہ ہے کہ خود ان کے اساتذہ کے یہاں دہلی اسکول کے محاسن نہیں پائے جاتے بلکہ دہلی اور لکھنؤ کے امتزاج سے ایک نئے رنگ کی جلوہ گری ان کے اساتذہ کے یہاں موجود ہے حسرت، اصغر اور فانی پر ان کے اساتذہ کا رنگ نہیں چڑھا، بلکہ انھوں نے اپنا انداز بیان ہی جداگانہ اختیار کیا، یہی وجہ ہے کہ حسرت و اصغر، جگر و سیماب صوبۂ اودھ کے مشاہیر شعرا اور خاص لکھنؤ کے باکمال اساتذہ، اثر، آرزو، صفی کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد قدرتی طور پر میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ لکھنؤ اسکول کی شاعری میں انقلاب ہو گیا ہے اور اسی بنا پر میں نے اسے "جدید لکھنؤ اسکول" سے تعبیر کیا، اگر بات یہیں ختم ہو جاتی تو کچھ مضایقہ نہ تھا لیکن انجمن بہار ادب نے اپنا تاریخی مشاعرہ کرکے دنیا کی نظروں سے عقیدت و ارادت کے بعض پردے اٹھا دئے، انجمن کی مجلس شوریٰ کے فیصلہ کے مطابق مجھے لکھنؤ آنے پر مجبور کیا گیا اور میں ۲۰ فروری کو لکھنؤ پہونچا اور سرزمین اودھ کے اس مشہور جلوہ گاہ رنگ و نور میں قیام کیا جو اپنی آغوش میں عشرت ماضی کے بہت سے رنگین فسانے چھپائے ہوئے ہے

قیصر باغ کے ایک محل میں ٹھیرا جناب سراج، بدرالدین بدر اور احسان بن دانش سے بھی ملاقاتیں ہوئیں، تھوڑی دیر کے اندر پیاپے انجمن بہار ادب کے سرگرم ارکان نظم و نسق، کے سلسلہ میں آئے، اور سب سے تعارف ہوا

انجمن بہار ادب کے اس تاریخی جلسہ میں مشاعرہ بھی تھا، اور مناظرہ و مناثرہ بھی اور سارے لائحۂ عمل کو کامیاب بنانے کے لئے ارکان انجمن کی ہمت و مستعدی بھی، دہلی، کانپور، لکھنؤ اور اس کے مضافات کے نامی شعرا آئے، اتوار کے دن شب کے وقت جب میں مشاعرہ میں شریک ہوا، تو اتنا بڑا مجمع تھا کہ اتنا بڑا علمی مجمع میں نے صرف علیگڈھ میں اُردو کانفرنس کے موقعہ پر دیکھا تھا، قیصر باغ میں آخری شاہ اودھ کا دیوان عام سامعین کی کثرت اور علما و فضلا، ادبا و شعرا سے بھرا پڑا تھا آلہ مکبر الصوت نصب کیا گیا تھا اور اسی کے سامنے شعرا نے اپنی غزلیں و نظمیں اور ادیبوں نے اپنے مقالے پڑھے

مشاعرہ کی مختلف صحبتوں میں حاضر رہا اور شام سے دو اور تین بجے شب تک گرمی محفل دیکھا کیا۔ مشاعرہ کی پہلی صحبت میں جب میں شریک ہوا، تو طلبہ کی تمسخر انگیز تالیاں، سامعین کا قہقہہ نوازشور و فغاں اور سب سے بڑھکر شعرا کا مکبر الصوت کے سامنے بے سُرتال کے لحن کے ساتھ نغمہ و ترنم دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ بارالٰہا یہ بزم مشاعرہ ہے، یا کچھ اور ہے۔ شعرا اپنا کلام سنا رہے ہیں یا موسیقی ذبح کی جا رہی ہے۔ یہ شاعر نہ ترنم ریزیاں جناب مجذوب کی بڑھتے بیکر جناب قتیل و فانی کی بلند پایہ غزلوں تک، اور جناب روش کی عشقیہ غزلوں اور احسان بن دانش کی اثر انگیز نظموں سے لیکر جناب سراج اور قدیر کے تیم شعروں[1] تک یکساں جاری و ساری تھیں، لکھنوی شعرا نے موسیقی کے پردوں میں خصائص شعریہ کو گم کر دیا، لکھنؤ میں آج وہی کامیاب شاعر ہے جو اچھا گویا ہے اور مشاعرہ میں اسی کو زیادہ داد ملتی ہے جو سب سے زیادہ الاپنے کی اہلیت رکھتا ہے، شعر و غنا کے اس لایعنی امتزاج نے اچھے اچھے شعرا کے کلام سے بھی لطف اندوز نہ ہونے دیا، جناب رضا و جناب آرزو لکھنوی کے خوش ذوق شعرا میں سے ہیں، جناب آرزو کی اصلاحوں نے ان کے اندر ایک مخصوص شاعرانہ اہلیت پیدا کر دی ہے، لیکن انھوں نے بھی اپنے شعر سے زیادہ اپنے نغموں کے ذریعہ لوگوں کو مسخر کرنا چاہا، اور مجھے اس کا اعتراف کرنے میں مطلق باک نہیں کہ بنا بہ رضا شعر بھی اچھا کہتے ہیں اور اچھا گاتے بھی ہیں رضا صاحب کا وہ انداز شعر خوانی جس کا یہ سٹیج پر مظاہرہ کرتے تھے، دل سے کبھی محو نہیں ہو سکتا، جب کبھی دماغ میں وہ نقوش اُبھرتے ہیں تو بے اختیار ہنسنے کو جی چاہتا ہے، رضا صاحب اپنے پاکیزہ اخلاق کے لحاظ سے شاعر سے زیادہ انسان ہیں۔ اس لئے ان کی طرف سے دل میں ہر شخص ایک جذبہ لطیف محسوس کرتا ہے، اسی سلسلہ میں جناب عرشی بھی ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں وہ نہایت نیک سرشت اور بلند اخلاق کے انسان ہیں اور شعر کا بہت پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں، وہ بھی گا کر پڑھتے ہیں، لیکن ایک خاص دلکش لحن میں کہ شعر کی خصوصیت بھی قائم رہتی ہے اور نغمہ کی دل آویزی بھی۔ ان سے ملکر مجھے بے انتہا مسرت ہوئی۔ انجمن بہار ادب کے اس مشاعرہ نے بحیثیت مجموعی میرے دماغ پر بہت بڑا اثر ڈالا، میں نے لکھنؤ اسکول کے دور جدید کے متعلق جو نظریہ قایم کیا تھا، اس سے خود لکھنؤ ہی شعرا کی اکثریت بہت دور تھی، اس میں شک نہیں عہد حاضر میں لکھنؤ اسکول تعمیر ہے، حسرت، اصغر، جگر، فانی، آرزو اور

[1] میں نے یہ غزلیں نہیں دیکھیں، لیکن یہ جانتا ہوں کہ سراج و قدیر یہاں کے خوشگو و خوش فکر شعرا میں سے ہیں (نیاز)

صفی و آسی، جوش، روش و احسان کی ذات سے لیکر ان میں صفی، آرزو و اثر کے سوا سب لکھنؤ سے باہر کے رہنے والے ہیں، لکھنوی شعرا میں جناب سراج وقدیر اور حضرت آشفتہ کے دوسرے تلامذہ[1] میں شاعرانہ ابتذال اور فنی و ادبی خامیاں ہیں اور یہ لوگ زیادہ مرثیہ خوانی و غنا نوازی کی طرف رجحان رکھتے ہیں[2]۔ اسی بنا پر میں نے رائے قایم کی تھی کہ مشاعرہ میں لکھنؤ کے شعرا نے جو غزلیں پڑھیں ان میں فنی و افادی خصوصیت تو خیر کیا، البتہ مرثیہ خوانی والا سوز و گداز ضرور پایا جاتا تھا۔ لکھنؤ کے شعرا جدید لکھنؤ اسکول اور قدیم لکھنؤ دونوں سے بہت دور ہیں قدیم اسکول کی کم از کم یہ اہمیت تو ہمیشہ قایم رہیگی کہ یہ زبان اور فن کے اعتبار سے بہت بلند سطح کی چیز ہے عہد حاضر کے اکثر لکھنوی شعرا نے تغزل میں مرثیہ کا رنگ اور شعر خوانی میں غنا کی صورت پیدا کر دی ہے، انجمن بہار ادب نے احسان و روش کو بلا کر بہت بڑی کامیابی حاصل کی ورنہ مشاعرہ تو کم از کم بے کیف ضرور ہو جاتا، احسان کاندھلا کے رہنے والے ہیں جو غالباً مظفر نگر کے مضافات میں ہے، اسی طرح روش کا وطن جوالاپور ضلع سہارنپور ہے، احسان کے اندر مطالعہ فطرت کا بہت گہرا ذوق ہے، اور وہ بہت عمیق نظر کے ساتھ مناظر کی جزئیات کا مشاہدہ کرتے ہیں، وہ احساسات کے اعتبار سے بہت ہی ذکی الحس اور جذبۂ الفت کے لحاظ سے مکمل انسان ہیں احسان کے دل میں ایک لازوال ہوک ہے، وہ ہر منظر سے عبرت و بصیرت کا پیام حاصل کرتے ہیں وہ ہر درد انگیز سماں دیکھ کر اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ "غم" ان کی زندگی کا سرمایہ بنکر رہ گیا ہے، احسان کو کس چیز نے اس بلند سطح تک پہونچایا، ہر چند ان کی نجی زندگی کے معمولی واقعات بھی ہمارے پیش نظر نہیں لیکن میرا خیال ہے جس ماحول میں ان کی پرورش ہوئی وہ ان کے لئے حد درجہ حوصلہ آزما رہا ہے ہر زمانہ اور اہل زمانہ نے اپنی کم نگاہیوں سے ان کو ہمیشہ دردمند اور سوگوار رکھا، جہاں تک میرا گمان ہے وہ اس خاندان میں پیدا ہوئے، جس میں شرافت کی سربلندی تو ضرور تھی لیکن دنیا کی نظر میں دولت و ثروت اور اعزاز و تکریم کے اعتبار سے اس کا کوئی خاص مرتبہ نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ احسان نے اس ماحول میں آنکھیں کھولیں تو خود اپنی زندگی انکو سوگوار اور دردمند نظر آئی، اپنی پامالی اور زبوں حالی کے ساتھ ان کے اندر دنیا کے مصیبت زدہ انسانوں کے ساتھ سچی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں مزدور کی عید اور مزدور کی موت وغیرہ حد درجہ اثر انگیز ہیں انھوں نے مشاعرہ میں اپنی نظم "مزدور کی موت" پڑھی تو سارا مجمع اشکبار تھا اور بے اختیار میرا جی چاہتا تھا کہ احسان سے لپٹ کر خوب روؤں، احسان کی یہ نظم ان کا شاہکار ہے اور میرا خیال ہے اس کی نظیر اردو ادب میں مشکل ہی سے کسی دوسری جگہ مل سکتی ہے اس میں شک نہیں، احسان اپنے مبلغ علمی کے اعتبار سے کسی خصوصیت کے مالک نہیں، یہاں تک کہ وہ زبان اور فن کی عامیانہ غلطیاں بھی کر جاتے ہیں، لاہور کے قیام نے ان کی زبان پر پنجابی محاورہ کا اثر بھی ڈالا ہے

---

[1] سراج وقدیر، آشفتہ کے شاگرد نہیں ہیں (نیاز)

[2] میری رائے میں عبدالمالک صاحب کا یہ فیصلہ صحیح نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس مخصوص جلسہ کی غزلوں میں خامیاں ہوں (حالانکہ میں نے انھیں نہیں سنا) لیکن عمومی طور پر یہ حکم لگا دینا کہ سوائے ابتذال و خامی یا مرثیہ و غنا کے ان کے کلام میں کچھ نہیں پایا جاتا، زیادتی ہے۔ (نیاز)

لیکن ان تمام خامیوں کے باوجود ان کی نظمیں اس قدر اثر انگیز ہیں کہ جب وہ مجمع کے سامنے پڑھتے ہیں تو مجمع پر ایک کیف بیخودی طاری ہو جاتا ہے احسان اپنی معصومانہ فطرت نگاری کے اعتبار سے انگریزی زبان کے مشہور شاعر ورڈسورتھ سے بہت قریب ہیں جناب روش نوجوان شاعر ہیں، غزل بھی کہتے ہیں اور نظم بھی، شعریت ان پر اس قدر طاری ہے کہ یکسر حال، نظر آتے ہیں، صورت میں بھی ایک خاص دلکشی ہے، ژولیدہ مو، سادہ وضع، مضطرب الحال نوجوان شاعر جب پہلی مرتبہ اسٹیج پہ آیا تو میں اسے دیکھ کر بیحد متاثر ہوا، اس کی غزلیں ایک خاص پایہ کی تھیں، اس کی عمر اور اس کا رنگ تغزل، اس کا دلنواز لحن دیکھکر مجھے بے اختیار کیٹس اور عبدالحی تاباں کی یاد آگئی، خدا اسے چشم زخم سے بچائے، روش نظمیں بھی اچھی کہتے ہیں، لیکن ان کی غزلوں کے عشقیہ رشحات سامعین کو بہت متاثر کرتے ہیں۔ جناب آسی مضافات میرٹھ کے رہنے والے ہیں اور شاعری کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔ ان کے تلامذہ میں شوکت، امین اور عمر انصاری ہیں، امین نے میرے سامنے غزل نہیں پڑھی، شوکت اور عمر انصاری نے غزلیں پڑھیں اچھی تھیں

مناظرہ اور مناثرہ کے لئے ۲۸ فروری کا دن مقرر کیا گیا تھا، بلند پایہ ادیب و ماہرین فن تشریف لائے تھے، جناب پروفیسر مسعود حسن نے سنجیدہ پیرایہ میں لکھنؤ اسکول کے محاسن پر ایک بسیط مقالہ پڑھا، مسعود حسن صاحب بہت کمزور واقع ہوئے ہیں، انھوں نے مروت اور محبت میں بہت سی سطحی باتیں بھی کہہ ڈالیں۔ مشیر احمد علوی کا مضمون ادب و انشا کے لحاظ سے تو اچھا تھا لیکن اس میں ضعف استدلال اور معنوی لغویت کی بھی کمی نہ تھی، انھوں نے لکھنؤ اسکول کی تعریف و توصیف میں ہر وہ بات کہہ ڈالی جو ایک لکھنؤ پرست کے شایان شان تھی

قاضی خورشید حسنین اور ڈاکٹر عبدالعلیم (پروفیسر مسلم یونیورسٹی) نے لکھنؤ اسکول کی مخالفت میں تقریریں کیں، قاضی صاحب جوش میں اتنے بے تکلف ہو گئے کہ لکھنؤ والوں کو "آپ لوگ سخت نالایق ہیں" کہہ ڈالا، لیکن انھوں نے فنی خامیاں بھی دکھائیں ان کی بحث اچھی تھی، ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کھڑے ہوئے تو لکھنؤ اسکول کی شاعری پر تنقید کرنے کی بجائے معاشیات اور سیاست مدن پر زور بیان صرف فرمانے لگے، آپ کے نزدیک شاعر کی یہ تعریف ہے کہ وہ اپنا کلام سنائے اور لوگ اسکو سنکر عملی کارنامے پیش کریں، کوئی شاعر مزدور پر نظم لکھے تو لوگ صرف روئیں نہیں بلکہ عمل بھی کریں، یا للعجب! آپ نے ایک سانس میں میر سے لیکر تمام اردو شعرا کو بے مایہ اور ناحقیقت شناس کہہ ڈالا، میر پر آپ نے عجیب و غریب تنقید کی، میرا تو قیاس نہیں یقین ہے کہ آپ نے آبحیات نہیں پڑھی، محمد حسین آزاد نے میر کے متعلق یہ نہیں لکھا ہے کہ ایک کمرہ میں وہ بارہ سال تک بند رہے، لیکن اس کے دریچہ کے باہر کی چیز کبھی نہ دیکھی، اس سے آپ نے یہ استدلال کیا کہ میر صاحب جب فطرت کے مطالعہ سے اس قدر بیگانہ تھے تو بھلا وہ حقیقی معنی میں شاعری کیا کرتے، چہ خوش!

آبحیات میں جو روایت ہے وہ میر صاحب کی شعریت و شاعرانہ محویت پر دلالت کرتی ہے اگر محمد حسین آزاد کو یہ روایت کا یہ مفہوم نہ ہوتا جب بھی ڈاکٹر صاحب کو سمجھنا تھا کہ دنیا میں بہت سے نابینا شاعر گزرے ہیں، اور ان کے کمال سے تاریخ

کے صفحات بھرے ہیں ایک ابوالعلا معری کی مثال لے لیجئے یہ نابینا شاعر تھے، ہومر بھی نابینا تھا۔ عہد حاضر میں مصر کا مشہور ادیب و نقاد ڈاکٹر طہ حسین نابینا ہی ہے، ملٹن بھی آخری عمر میں بصارت سے محروم ہو گیا تھا، کیا دنیا ان کے کمالات سے کبھی انکار کر سکتی ہے

اب دو حضرات اور باقی رہ جاتے ہیں ان میں ایک نے اپنے مزاحیہ مضمون اور دوسرے نے اپنی رنگین تقریر سے مجلس میں ہنسنے ہنسانے کا کافی سامان پیدا کر دیا۔ ان میں ایک تو جناب شوکت ہیں اور دوسرے جناب بشیر، جناب شوکت کو میں نے ہمیشہ تیسرے درجہ کا مزاحیہ نگار سمجھا، ان کی "منگنی" بھی لوگ دیکھ چکے ہیں اور "سودیشی ریل" بھی، ان کے سارے مضامین میں ایک عامیانہ طبیعت کے سوا کسی بلند ذوقی کا پتہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ اہل نظر کے سامنے انکی مزاحیہ نگاری کوئی وقعت نہیں رکھتی، رشید، فرحت اور پطرس نے مزاحیہ نگاری میں نقد ادب و انشا کی اہم خدمتیں انجام دی ہیں، وہ ہنساتے بھی ہیں اور کام کی بات بھی کہہ جاتے ہیں اس کے برخلاف شوکت صرف ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں، انکا کوئی مطمح نظر نہیں، یوں بھی جناب شوکت کا علمی پایہ بالکل سطحی ہے جو شخص اپنی کتاب کا نام "سیلاب تبسم" رکھے اور انجمن بہار ادب کی بھری مجلس میں "نسلاً بعد نسلاً" کی غلط ترکیب لکھکر لوگوں کو سنائے، اس سے کسی نوع کی علمی تنقید کی توقع کرنا بے محل سی بات ہے

سب سے آخر میں جناب بشیر کی تقریر کے متعلق کچھ عرض کر دوں گا، بشیر صاحب کی خوش روئی اور جامہ زیبی صحت جوانی دیکھنے کے بعد لکھنؤ کے "بانکپن" کی یاد تازہ ہوتی تھی، انھوں نے دہلی اسکول پر ایراد کرتے ہوئے لکھنؤ اسکول کے محاسن پر روشنی ڈالی اور اس سلسلہ میں لکھنؤ کے تانگے والوں کی پھبتی سے لیکر "عید پیچھے پڑ" کے واقعات پر تبصرہ فرمایا، شاہانِ اودھ کی رنگین مزاجی، خوش ذوقی اور عشرت کامی کے فسانے بیان کئے اور اس شعر

آغا تقی کے باغ میں کچھا انار کا چھاتی پٹک کے مر گیا لونڈا سنار کا

سے بھی فلسفیانہ نتیجہ نکالا، میرا خیال ہے ان کی آزاد تقریر سے لکھنؤ والے کچھ خوش نہ ہوں گے، کیونکہ بیسویں صدی میں انھیں الزامات کو جو سرزمین اودھ پر دوسروں کی طرف سے عاید کئے جاتے ہیں اپنے دامنِ عصمت پر داغ سمجھ کر وہ ان واقعات کو دھونے کی کوشش کر رہے ہیں، بانکے مقرر نے کچھ اس دلفریب انداز میں بیان کئے کہ چاہے کوئی مانے یا نہ مانے میں جناب بشیر کی اس تقریر سے ان کے فلسفیانہ رجحان کا ضرور قایل ہو گیا، انھوں نے معمولی معمولی واقعات سے اچھے اچھے نتائج نکالے میرے خیال میں ان کی تقریر بہت کامیاب تھی

مجھے آخری دن شب کے وقت مقالہ پڑھنے کا حکم دیا گیا، مجھ سے قبل جن صاحب نے اپنا مقالہ پڑھا تھا انکا انجام دیکھ کر میں ہرگز اس کے لئے تیار نہ تھا لیکن اراکین انجمن کے تقاضہ سے مجبور تھا، طلبہ غزلیں اور نظمیں سننے کے لئے سخت مضطرب تھے، اور وہ اپنے جماعتی اثر و اقتدار کے زعم میں وہ ساری حرکتیں کر رہے تھے، جن کی بنا پر جرمن ماہر نفسیات

اڈورڈ ڈاشپر انگرنے لکھا ہے کہ نوجوانوں میں "منوانے" کی اہلیت بہت زبردست ہوتی ہے، وہ تالیاں بجا رہے تھے، پھبتیاں کہہ رہے تھے، ہال ان کے شور و شغب اور بے باکانہ ہنگامہ پروری سے گونج رہا تھا ایسی فضا میں کسی خشک علمی بحث کا آغاز و انجام دونوں برابر تھا۔ مجھے طلبہ کی جماعت سے بڑا اُنس ہے اس لئے نہیں کہ میں نوجوانوں کے غیر مہذب طریق زندگی کو پسند کرتا ہوں بلکہ اس لئے کہ ان کی نفسیات کے مطالعہ سے بعض دلچسپ حقایق کا انکشاف ہوتا ہے، بہر حال میرا ارادہ نہ تھا کہ میں اپنا مقالہ پڑھوں اس لئے کہ یہ علمی مجلس طلبہ کی شر انگیزیوں سے اس لایق نہ تھی کہ یہاں کسی سنجیدہ بحث پر ایک لمحہ بھی صرف کیا جائے، لیکن خوف یہ تھا کہ انجمن بہار ادب کے وہ افراد جو پہلے ہی بدگمان نظر آرہے تھے کہیں یہ نہ فیصلہ کرلیں

زاہد نہ یافت تاب جمال پری رخاں　　کنجے گرفت و ترس خدا را بہانہ ساخت

جہاں تک افادیت کا تعلق تھا، پڑھنا نہ پڑھنا دونوں برابر تھا، لیکن "حق نمک" سمجھ کر میں نے اپنے مقالہ کا حصہ ادھر اُدھر سے غیر مربوط طریقہ پر پڑھ دیا، میں مقالہ ختم کرکے اسٹیج سے اُترا تو جناب پنڈت انند نرائن ملا اور انجمن کے دوسرے اراکین نے مقالہ طلب کیا، چونکہ انجمن غزلوں اور نظموں کے ساتھ مقالے بھی اپنے اہتمام سے شایع کرے گی، میرے مقالہ کا مسودہ صاف نہ تھا، میں نے یہ کہدیا کہ صاف کرکے اس کی نقل بھیجدوں گا

انجمن نے ملک کے مختلف اطراف سے لوگوں کو بلایا تھا کہ وہ لکھنؤ اسکول کے جدید رنگ کے متعلق اپنی رائیں دیں تاکہ لکھنؤ اسکول کے متبعین کو استفادہ کا موقعہ ملے اور اس طور سے انجمن اپنی زندگی میں اپنی افادیت کا ایک غیر فانی نقش قایم کرجائے، لہذا میں نے فیصلہ کیا کہ میرے اختلافات اتنے سنگین ہیں کہ اراکین انجمن اپنے اہتمام سے اسے شایع کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے اس لئے اب میں اسے اپنے "نگار" میں شایع کئے دیتا ہوں، مجھے بیحد مسرت ہوگی اگر سنجیدہ حضرات اسکے خلاف آواز اُٹھائیں گے کیونکہ بہت ممکن ہے میں نے مشاہدہ اور نتیجہ نکالنے میں غلطیاں کی ہوں۔

"نگار" کے پُرانے پرچے

نگار کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کرلیں، قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:-

(۱۹۲۲ء) ستمبر ۴؍ - (۱۹۲۶ء) جنوری، جون، نومبر ۵؍ فی پرچہ - (۱۹۲۷ء) اپریل، مئی و جون ۴؍ فی پرچہ (۱۹۲۹ء) دسمبر ۵؍ - (۱۹۳۰ء) مئی ۴؍ - (۱۹۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴؍ فی پرچہ - (۱۹۳۲ء) فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل ۴؍ فی پرچہ - (۱۹۳۳ء) فروری - جولائی و اکتوبر ۴؍ فی پرچہ - (۱۹۳۴ء) مارچ ۴؍ - (۱۹۳۵ء) نومبر ۵؍ - (۱۹۳۶ء) فروری - مارچ - اپریل - جون - نومبر - دسمبر ۵؍ فی پرچہ - (۱۹۳۷ء) مارچ - اپریل - مئی - جون - جولائی - اگست - اکتوبر - نومبر و دسمبر ۸؍ فی پرچہ -

منیجر نگار۔ لکھنؤ

وفاق

(ریاستیں اور حکومتِ بالادست)

وفاق میں شریک ہونے کے بعد ریاستوں کا نظم حکومت کیا شکل اختیار کریگا۔ یہ معلوم کرنے کے لئے متعدد چیزوں کا مطالعہ ضروری ہے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ایک ریاست کی دستاویز شرکت کن شرائط کی حامل ہے اور اسی کے ساتھ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کا وہ حصہ بھی سامنے رکھنا ہوگا جو دستاویز شرکت سے متاثر نہیں ہوتا۔ پھر مقننۂ وفاق کے قوانین وضوابط، کونسل کے اعلانات، ریاست کے اندرونی قوانین اور حکومت بالادست کے اختیارات، یہ تمام وہ چیزیں ہیں جن پر غور کئے بغیر ایک ریاست کا صحیح پوزیشن معلوم کرنا دشوار ہے۔ لیکن چونکہ اس وقت ان میں سے اکثر باتیں ایسی ہیں جو مستقبل سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ آئندہ کیا صورتیں پیدا ہوں گی، لیکن کم از کم جس حد تک گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ اور اختیارات حکومت بالادست کا تعلق ہے، ہم کسی نہ کسی نتیجہ پر ضرور پہونچ سکتے ہیں

وفاق میں شریک ہونے کے بعد ایک ریاست تین حیثیتیں اختیار کریگی۔ ایک حیثیت تو خود ریاست ہونے کی ہے جہاں رئیس یا فرمانروا شخصی حیثیت سے اپنی رعایا پر حکمرانی کرنے کا مجاز ہے، دوسری حیثیت اُس سیاسی وحدت Political Unit کی ہے جس کے متعلق تاج برطانیہ اپنے حقوق بالادستی استعمال کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور تیسری حیثیت وفاق کے ممبر ہونے کی جس کی رو سے وہ ایک مشترک تاج، ایک مشترک مقننہ اور ایک مشترک اگزیکیٹو اور عدلیہ کے تحت، وفاق کے دوسرے ممبروں سے آئینی تعلقات رکھنے پر مجبور ہوگی

ریاستوں کی پہلی حیثیت فیڈریشن میں بہت محفوظ کردی گئی ہے، کیونکہ وفاق کسی ریاست کی رقبائی (Territorial) اور سیاسی حیثیت پر بالکل موثر نہیں ہوتا۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں پوری صراحت کردی گئی ہے کہ وفاق کا اگزیکٹیو ریاستوں کے اُن معاملات پر کسی طرح موثر نہ ہوگا جو مقننۂ وفاق کے حدود سے باہر ہیں اور جو معاملات مقننۂ وفاق کے حدود کے اندر آتے ہیں، ان میں بھی صرف ان شرائط کی پابندی کے ساتھ دست اندازی کی جائے گی جو ریاستوں نے دستاویز شرکت میں متعین کردی ہیں

مقننۂ وفاق ریاست کے عرف ان مسایل کے متعلق قانون وضع کرسکتا ہے جو دستاویز شرکت میں مخصوص شرایط کے ساتھ وفاق کے سپرد کئے گئے ہیں اور ان سے ہٹ کر وہ ریاست کے کسی مسئلہ پر رائے زنی نہیں کرسکتا، اسی طرح عدلیۂ وفاق (Federal judiciary) کو بھی ریاست کے ان معاملات میں فیصلہ صادر کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے جو وفاقی عدالت سے تعلق رکھتے ہیں۔ الغرض حکومت وفاق ریاستوں کے متعلق کوئی طرز عمل ایسا اختیار نہیں کرسکتی جو انکی خود مختارانہ حیثیت پر اثر انداز ہو۔ ملک معظم کو یہ اختیار تو حاصل ہوگا کہ وہ صوبوں کی سرحدیں بدلدیں ان کے رقبے کم وبیش کردیں لیکن ریاستوں کی بابت اس کو اس قسم کا کوئی اختیار حاصل نہ ہوگا علاوہ اس کے تاج نے ریاستوں سے جو معاہدے کئے ہیں یا جو سندیں ریاستوں کو ملی ہیں وہ سب اس ایکٹ سے بالاتر ہیں اور حکومت وفاق کو ان میں چون وچرا کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

عرصہ سے ریاستوں کے نظم ونسق کی صورت یہ چلی آرہی تھی کہ رئیس وہاں کا حاکم مطلق سمجھا جاتا تھا اور اسے اپنی رعایا پر پورا اختیار حاصل ہوتا تھا، اس کا ہر ہر لفظ قانون کی حیثیت رکھتا تھا اور وہ کسی سے مشورہ کرنے پر مجبور نہ تھا، لیکن اب حالات میں تبدیلی پیدا ہورہی ہے اور جب سے برطانوی ہند کی آبادی کے تتبع میں وہاں کی آبادی نے بھی اپنے سیاسی وشہری حقوق طلب کرنا شروع کئے ہیں بعض بڑی بڑی ریاستوں میں کونسلیں قایم ہوگئی ہیں اور کہیں کہیں قانون ساز اسمبلیاں بھی نظر آتی ہیں، لیکن بانیہمہ رئیس کی ذاتی وشخصی وجاہت حدود ریاست کے اندر بدستور قایم ہے اور وہ کونسلوں واسمبلیوں کا پابند نہیں ہے

البتہ تاج اور ریاستوں کا تعلق ایسا ضرور ہے جو والیان ریاست کی مطلق العنانی اور خود مختاری کی راہ میں ایک سنگ گراں کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر چند تاج اور ریاستوں کے یہ تعلقات مخصوص معاہدوں اور سندوں پر قایم ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ ان تمام معاہدوں میں ریاستوں کی خود مختاری کو بڑی حد تک تسلیم کیا گیا ہے لیکن رفتہ رفتہ مختلف حالات ومصالح کی بنا پر ان تعلقات کی صورت ایسی ہوگئی ہے کہ جو آزادی وخود مختاری رؤسا ہند اپنی ریاستوں کے حدود کے اندر چاہتے ہیں وہی مطلق العنانی حکومت بالادست نے ریاستوں کے باب میں اختیار کرلی ہے۔ رؤسا کا عزل ونصب، ریاستوں کا بنانا بگاڑنا، گھٹانا بڑھانا (جس کی متعدد مثالیں تاریخ میں نظر آتی ہیں) حکومت بالادست نے اپنا حق سمجھ لیا ہے اور جب وہ اپنے اغراض کے تحت کوئی ایسی دست اندازی ضروری سمجھتی ہے، تو اس کے سامنے نہ معاہدات کا سوال ہوتا ہے نہ سندات کا، اور چونکہ یہ اغراض زیادہ تر سیاسی ہوتی ہیں اس لئے رفتہ رفتہ پولٹکل ڈپارٹمنٹ کا اثر ریاستوں میں قوی ہوتا جارہا ہے اور تاج کے اختیارات گویا حکومت ہند کے محکمۂ سیاسیات ہی کے سپرد کردئے گئے ہیں۔

یہ صورت چونکہ ریاستوں کے لئے نہایت تلخ وناگوار ہے اس لئے دستور جدید کی تنظیم سے قبل ہی انھوں نے اپنی چیمبر میں بارہا اس سوال کو اٹھایا اور جب وفاقی حکومت کی تشکیل ہونے لگی تو زیادہ زور اسی پر دیا کہ ان کے جو تعلقات تاج سے قایم ہیں وہ تاج ہی سے وابستہ رہنا چاہئے اور محکمۂ سیاسیات کی گرفت دور کرکے اُن کے ساتھ وہی تعلقات پیدا کرنے چاہئیں جو معاہدات وسندات میں متعین ہوچکے ہیں اور یہ کہنا غالباً خلاف حقیقت ہوگا کہ وفاقی حکومت میں رئیسوں کے ان مطالبات کی رعایت ملحوظ

نہیں رکھی گئی

جدید ایکٹ کی دفعہ ۲۸۵ میں پوری صراحت کے ساتھ درج ہے کہ سوائے ان مسایل کے جو ریاستوں نے خود اپنی دستاویز شرکت کی رو سے وفاق کے سپرد کر دئے ہیں اور تمام مسایل میں تاج اور ریاستوں کے تعلقات علی حالہا قایم رہیں گے اور جو حقوق آزادی رئیسوں کو پہلے حاصل تھے ان میں کوئی تغیر پیدا نہ ہوگا

سر سموئیل ہور نے مارچ ۳۵ء میں جو ڈسپیچ حکومت ہند کے پاس روانہ کیا تھا اس میں لکھا تھا کہ "بل میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو حکومت بالادست کے اختیارات پر اثر انداز ہو۔ بل کا مقصود صرف یہ ہے کہ سوائے ان معاملات کے جو ریاستیں خود اپنی مرضی سے وفاقی مقننہ و مجلس عاملہ کے سپرد کر دیں اور کسی معاملہ میں حکومت بالادست اور ریاستوں کے تعلقات اثر پذیر نہ ہوں یہاں تک کہ اگر ریاستیں وفاق میں شریک نہ ہوں تو بھی اس بل کی رُو سے ان کے اور تاج کے تعلقات میں کوئی فرق پیدا نہ ہوگا"

اب قوت بالادست کی اہمیت اور اس کی نوعیت و وسعت کو سامنے رکھ کر ریاستوں کی پوزیشن پر غور کرنا چاہئے

قوت بالادست

قوت بالادست کا واقعی مفہوم کیا ہے؟ اس کی صراحت کمیٹی ریاستہائے ہند نے ان الفاظ میں کی ہے کہ "قوت بالادست سے مراد تاج ہے جو بہ واسطہ وزیر ہند و گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل و ذمہ داری پارلیمنٹ ریاستوں سے تعلق رکھتا ہے" لیکن اسی کے ساتھ یہ اصرار بھی ہے کہ ہندوستانی ریاستوں پر تاج کی برتری ہندوستان کے فرمانروا ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے اور اس لئے ہندوستان کی عنان حکومت جس کے ہاتھ میں ہوگی وہی اختیارات بالادستی استعمال کر سکے گا یعنی اگر ہندوستان کو مستعمراتی آزادی مل گئی تو تاج کی ہندوستانی فرمانروائی اسکی برطانوی فرمانروائی سے علحدہ ہو جائے گی اور اس صورت میں ہندوستان کی حکومت کو حقوق بالادستی حاصل ہو جائیں گے۔

والیان ریاست نے اس کی مخالفت میں دو دلیلیں پیش کیں۔ ایک یہ کہ تاج اور رؤسا ہند کے تعلقات بالکل ذاتی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ کسی طرح مناسب نہ ہوگا کہ ہندوستان کی ڈماکریٹک حکومت کو اتنے اختیارات دیدئے جائیں کہ وہ والیان ریاست کی شخصی وجاہت اور خاندانی اہمیت کے سوالوں کو طے کرنے لگے۔ دوسری دلیل انھوں نے یہ پیش کی کہ ریاستوں کے معاہدے براہ راست تاج سے ہوئے ہیں اس لئے تاج کو کوئی حق حاصل نہیں کہ اپنے وہ تمام حقوق جو معاہدوں کے ذریعہ سے حاصل ہوئے ہیں، رؤسا کی مرضی حاصل کئے بغیر کسی اور فریق کو سونپ دے

سچ پوچھئے تو رؤسا ہند کی یہ دونوں دلیلیں کمزور ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ تاج کے ساتھ ان کے تعلقات بالکل ذاتی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے درست نہیں کہ تاج برطانیہ خود فی الحقیقت حکمراں نہیں ہے بلکہ یہ خدمت کابینہ انجام دیتی ہے اور اسکی مرضی کے بغیر تاج کچھ نہیں کر سکتا، اب رہی دوسری دلیل کہ ریاستوں کے معاہدے براہ راست تاج سے ہوئے ہیں سو اسکی کمزوری اس سے ظاہر ہے کہ ۵۸ء سے قبل جو معاہدے ہوئے تھے وہ تاج سے نہیں بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور انکے گورنروں سے ہوئے تھے اور انھیں کو وہ ذمہ دار سمجھتے تھے چنانچہ ان معاہدوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تاج برطانیہ کو فریق ثانی قرار نہیں دیا گیا ہے۔ کمیٹی ریاستہائے ہند نے اسکی تردید

اس طرح کی ہے کہ چونکہ ۱۸۵۷ء تک، ایسٹ انڈیا کمپنی، نمایندۂ تاج کی حیثیت سے کام کرتی رہی تھی اس لئے یہ وساطت کمپنی فی الحقیقت تاج ہی قوتِ بالادست کی حیثیت رکھتا تھا لیکن ریاستوں کے پرانے معاہدوں سے اس کا پتہ نہیں چلتا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نمایندۂ تاج کی حیثیت سے کام کر رہی تھی، چنانچہ اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب غدر کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۸۵۸ء نافذ ہوا تو اس میں وضاحت کی ضرورت سمجھی گئی کہ کمپنی سے جتنے معاہدے رئیسوں کے ہوئے ہیں ملکۂ معظمہ ان سب کی پابند رہیں گی" اگر تاج برطانیہ پہلے ہی سے فریقِ ثانی کی حیثیت رکھتا تو پھر ایکٹ ۱۸۵۸ء میں اسکے اظہار کی ضرورت نہ تھی

لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ کمپنی کے ساتھ جو معاہدے ہوئے تھے وہ فی الحقیقت تاج ہی سے ہوئے تھے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تاج نے کمپنی کی بجائے "حکومتِ ہند" کو اپنا نمایندہ قرار دیا تو اسوقت ریاستوں نے کیوں احتجاج نہیں کیا کہ بغیر ان کی مرضی کے "حقوقِ معاہدہ" دوسرے فریق کے سپرد کئے جا رہے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ چونکہ تاج کو قانونی حیثیت سے آزادی و خود مختاری حاصل نہیں ہے بلکہ اپنے مشیروں کے مشورہ پر عمل کرنا اس کا فرض ہے اس لئے ریاستوں کا براہِ راست تاج کو فریق سمجھ کر اس سے معاملہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا، تاہم بٹلر کمیٹی نے رئیسوں کے ان اعتراضات کو صحیح مان کر اسکا مداوا یوں کر دیا ہے کہ جدید ایکٹ میں گورنر جنرل اور وائسرائے کی دو حیثیتیں علیحدہ کر دی گئی ہیں اول الذکر حیثیت مرکزی حکومت کے حاکمِ اعلیٰ ہونے کی ہے اور موخر الذکر نمایندۂ تاج ہونے کی۔ اور غالباً اس سے زیادہ قابلِ اعتماد صورت ریاستوں کے لئے اور کوئی پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اس [illegible] وفاق میں شرکت کے بعد رئیسوں کی پوزیشن پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے اور حکومتِ ہند کے محکمۂ سیاسیات کی گرفت [illegible] بڑی حد تک آزاد ہو جاتے ہیں

اس سلسلہ میں ایک پہلو بہت زیادہ غور طلب ہے یعنی قوتِ بالادست اور ریاستوں کے درمیان جو تعلقات اسوقت پائے جاتے ہیں وہ وفاق کے بعد علی حالہا قائم رہیں گے یا نہیں اور اگر ان میں کوئی تغیر پیدا ہوا تو اس کی نوعیت کیا ہوگی۔ اس کا فیصلہ کرنے سے قبل یہ دیکھنا چاہئے کہ قوتِ بالادست کو خود ریاستیں کیا سمجھتی ہیں اور وہ خود اپنے کو کیا سمجھانا چاہتی ہے

مسٹر پانیکار نے تاج اور ریاستوں کے باہمی تعلقات کی تعیین میں، اسناد و معاہدات کو سامنے رکھ کر بہت زیادہ وسیع زاویۂ نظر سے کام لیا ہے، لیکن کمیٹی ریاستہائے ہند نے صاف صاف ظاہر کر دیا ہے کہ قوتِ بالادست (پارامونٹسی) کی کوئی جامع و مانع تعریف کرنا بہت دشوار ہے کیونکہ وقت و ضرورت کے لحاظ سے اس کا وسیع ہوتے رہنا ضروری ہے، لیکن اسکا اثر اس اعتماد پر کچھ نہیں پڑتا جو ریاستوں نے تاج کی طرف سے قائم کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ قوتِ بالادست خواہ کتنی ہی وسیع ہو جائے لیکن اس کی یہ وسعت ریاستوں کی حفاظت کی ذمہ دار ضرور ہے اور جو نسلیں ریاستوں میں حکمران چلی آ رہی ہیں ان کا انقطاع کبھی تاج یا قوتِ بالادست کو گوارا نہیں ہو سکتا۔

ریاستیں جس نقطۂ نظر سے اپنے اور تاج کے تعلقات کو دیکھنا چاہتی ہیں، وہ صحیح نہیں ہے۔ ریاستیں زیادہ تر قدیم معاہدات و اسناد پر زور دیتی ہیں، لیکن انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ سلطنتوں کے مواعید، انسانی وعدوں سے بھی زیادہ ضعیف ہوا کرتے ہیں، چنانچہ جن حضرات نے یوروپ کی سیاسیات ماضیہ و حال اور حکومتوں کے اتحاد و اختلاف کا مطالعہ کیا ہے انسے مخفی نہیں کہ معاہدوں کی حیثیت اس کاغذ کی سی ہے جو ہر وقت ردی کی ٹوکری میں ڈالا جا سکتا ہے۔ ہر چند ہندوستان کے رؤسار کے ساتھ حکومتِ بالادست نے اتنی زیادہ عہد شکنیاں نہیں کی ہیں، لیکن اسی کے ساتھ بقول لارڈ کرزن "تاج کے اختیارات کو چیلنج بھی نہیں کیا جا سکتا"، اور اس کی تصدیق اُس ڈسپیچ سے بھی ہوتی ہے جو سر سموئیل ہور نے ۱۴ مارچ ۳۵ء کو رؤسار کی شکایت کی جواب میں روانہ کیا تھا[1]

ریاستوں کا پوزیشن یہ ہے کہ نہ وہ برطانوی عدالتوں میں طاقت اعلیٰ کے خلاف کوئی مقدمہ دایر کر سکتی ہیں اور نہ کسی بین الاقوامی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتی ہیں اس لئے عہدناموں سے ریاستوں کو قانونی حقوق حاصل نہیں ہوتے بلکہ انسے صرف سیاسی رہنمائی کا کام لیا جا سکتا ہے اور اس سلسلہ میں حکومت اور ریاستوں کے باہمی طرزِ عمل نے بھی زیادہ تر رواجی صورت اختیار کر لی ہے لیکن یہ رسم و رواج بھی کوئی پایدار و مستقل چیز نہیں کیونکہ حسب ضرورت قوت بالادست وہ صلحنامول اور رسم و رواج دونوں کو نظر انداز کر کے کوئی تیسری صورت اختیار کر لیتی ہے۔ الغرض قوت بالادست کی کوئی تعریف متعین نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس کا ارتقار ہنوز ختم نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے جب تک ریاستوں کی موجودہ پوزیشن قایم ہے

ریاستوں کے لئے قوتِ بالادست کے طوفان سے بچنے کی صرف دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، یا تو ان کی حیثیت بین الاقوامی ہو جائے، جو ممکن نہیں، یا پھر وہ فیڈریشن میں شریک ہو کر خود مختار صوبوں کی طرح ایک مستقل سیاسی وحدت اختیار کر لیں،

دستورِ جدید کے نفاذ کے سلسلہ میں جب ریاستوں کو معلوم ہوا کہ ان کو بھی وفاق میں شریک ہونے کی دعوت دیجائے گی اور بغیر ان کی شرکت کے وفاق ممکن نہیں ہے، تو اس سیاسی گرفت کے خلاف جو عرصہ سے ریاستوں کو اپنے قابو میں رکھے ہوئے تھی ردِ عمل شروع ہوا اور انھوں نے سوچا کہ اپنی آزادی اور خود مختاری تسلیم کرا لینے کا یہ موقعہ اچھا ہے اور شرکتِ وفاق کی اولین شرط انھوں نے یہ قرار دی کہ ان کی سیادت (Paramountcy) ان کے علاقوں میں باقی رکھی جائے اور برطانیہ کے محکمۂ سیاسیات سے ان کے تعلقات الگ کر کے براہ راست تاج سے وابستہ کر دئے جائیں

ریاستوں کا یہ خیال اپنی جگہ بالکل برمحل تھا، لیکن انھوں نے اس طرح ایک نہایت پیچیدہ بحث چھیڑ دی اور اس سلسلہ میں خود ان کو بھی سب سے پہلی مرتبہ یہ غور کرنا پڑا کہ سیادت کا اصل مفہوم کیا ہے اور اپنی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے

---

[1] رؤسار نے شکایت کی تھی کہ ان کے اختیارات سلب کئے جا رہے ہیں اسلئے حکومت بالادست کی تعریف متعین کر دیجائے۔ سر سموئیل ہور نے جواب دیا کہ "مجھے یقین نہیں کہ والیان ریاست نے یہ شکایت اس لئے کی ہے کہ وہ اپنے اور ملک معظم کے موجودہ تعلقات پر کچھ اعتراض کرنا چاہتے ہیں"

جس سیادت کے وہ متمنی ہیں اس کی نوعیت کیا ہوسکتی ہے

صورت یہ ہے کہ جسوقت رؤسا اپنے قدیم عہدناموں اور اسناد کو دیکھتے ہیں تو ان میں سے بعض اپنے آپ کو برطانیہ کا حلیف سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں، لیکن جب اسی کے ساتھ اس کے طریق عمل پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالکل بیدست و پا ہیں اور انھیں حدود ریاست کے اندر بھی وہ سیادت حاصل نہیں ہے جو ایک خودمختار فرمانروا کو حاصل ہونا چاہیئے

اس بحث میں سب سے پہلے یہ سوال غور طلب ہے کہ آیا ریاستوں کو سیادت حاصل ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو کس نوعیت کے ساتھ اور اگر نہیں ہے تو ان کی سیاسی پوزیشن کیا ہے

کہا جاتا ہے کہ خود ریاستیں مدعی ہیں کہ وہ مطلق العنان (Sovereign) ہیں اور ان کا یہ دعویٰ معاہدوں اور اسناد کی بنا پر ہے، لیکن چونکہ آزادی و مطلق العنانی کا تعلق صرف کاغذات سے نہیں بلکہ عمل سے ہے اس لئے ریاستوں کا یہ دعویٰ درست نہیں معلوم ہوتا

ایک ریاست ہمیشہ اسی وقت صحیح معنے میں آزاد و خودمختار سمجھی جاسکتی ہے جب اس کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو یعنی وہ دوسری اجنبی ریاستوں سے براہ راست سیاسی تعلقات پیدا گفت و شنود کرسکتی ہو، اپنے اختیار سے صلح و معاہدہ کرسکتی ہو اور اگر کوئی قوت اس کی مخالفت پر آمادہ ہو تو اس سے جنگ کرسکتی ہو۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ سیاسیات میں اس کی انفرادی حیثیت کا قایم ہونا ضروری ہے۔ اور ہندوستان کی اسوقت کوئی بڑی سی بڑی ریاست ایسی نہیں ہے جو ان تمام باتوں پر قادر ہو۔

کوئی خودمختار حکومت و سیادت نہ کسی کو عطا کی جاتی ہے اور نہ اسے فنا کیا جاسکتا ہے اور نہ اس میں تغیر و تبدل ہوسکتا ہے اور اگر کوئی طاقت ایسی ہے جو یہ سب کچھ کرسکتی ہے تو اصل سیادت و ملوکیت اسی طاقت کی مانی جائے گی۔ ریاستوں کی تاریخ دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ برطانیہ نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ نئی ریاستوں کی تخلیق کے مثال میں میسور، ٹونک، راج پیپلا، جھالاواڑ گڑھوالی، بنارس اور کپورتھلہ کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ قوت بالادست نے کئی ریاستوں کو فنا بھی کیا ہے اور انیسویں صدی کے ابتدائی ۴۰ سال میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ یہ ریاستیں کسی جنگ یا فتح کے سلسلہ میں ختم نہیں ہوئیں بلکہ اس وقت برطانوی حکومت میں شامل کی گئیں جب ملک میں امن و امان تھا اور ریاست کی طرف سے مطلقاً کوئی وجہ اشتعال پیدا نہ ہوئی تھی۔ ریاست تنجور کا برطانوی علاقہ میں شامل کرلیا جانا اس کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ ہرچند اب ریاستیں برطانوی علاقہ میں شامل نہیں کی جاتیں، مگر اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ برطانیہ کو اس کا حق حاصل نہیں بلکہ بقول سر لیوس پیل (Sir Lewis Tupper) وجہ صرف یہ ہے کہ ریاستوں کا قایم رکھنا خود برطانیہ کے لئے مفید ہے

ریاستوں کا رقبہ بڑھا دینے کی مثال دامودر۔ گودردان والے مقدمہ میں ملتی ہے اور کسی ریاست کے حدود کم کردینے کی مثال برار ہے۔ علاقہ چھین لینے کی ایک اور مثال ریاست بنود کا واقعہ ہے کہ بغیر استمزاج رئیس ایک پرگنہ خود لے لیا اور ایک پرگنہ ریاست سوئی پور میں منتقل کردیا

اس میں شک نہیں کہ والیان ریاست کی نقل و حرکت کے وقت اکثر وہی مراسم ادا کئے جاتے ہیں جو خود مختار بادشاہوں کے لئے مخصوص ہیں اور برطانیہ کی عدالتوں میں رئیسوں کا وہی درجہ ملحوظ رکھا گیا ہے جو بادشاہوں کا، لیکن یہ سب کچھ ذاتی اعزاز کی حیثیت رکھتا ہے اور سیاسی مصلحت اس کی مقتضی ہے

اس قدر بیان سے یہ امر واضح ہو گیا ہو گا کہ ریاستوں کو خود مختار سلطنت کی سی پوزیشن حاصل نہیں ہے اور نہ وہ اسکا دعویٰ کر سکتی ہیں ان کی پوزیشن کے متعلق اگر کسی حد تک کوئی صحیح تخیل قایم ہو سکتا ہے تو وہ قریب قریب وہی ہو گا جو اقطاعی نظام (Feudalism) کا ہے یعنی کسی کو اس شرط پر زمین دیدینا کہ وہ ضرورت کے وقت فوجی امداد کرے گا۔ ہر چند قوت بالادست اور ریاستوں کے باہمی تعلقات پر اقطاعی نظام پوری طرح منطبق نہیں ہوتا تاہم اگر کسی نظام سے اسے تشبیہ دیجا سکتی ہے تو وہ اقطاعی حکومت ہی ہے

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ریاستیں مطلق العنان حکومتیں نہ تھیں اور ان کی زندگی بالکل قوت بالادست کے رحم و کرم پر منحصر تھی، تو ان کو کیوں باقی رکھا گیا اور برطانیہ نے ریاستی ہند کو کیوں نہ اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔

ریاستوں کی خود مختاری کی دلیل میں یہ سوال پیش کرنا، بے خبری کی علامت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی کی ابتدا ہی میں برطانوی مدبرین کے سامنے یہ سوال آیا تھا کہ ریاستوں کا قایم رکھنا مناسب ہے یا نہیں۔ لیکن چونکہ اسوقت ہندوستان میں انگریزی فوج کم تھی اور بحری قوت بھی اتنی زبردست نہ تھی کہ انگلستان میں بیٹھکر ہندوستان کی حفاظت بہ آسانی ہو سکتی، اس لئے پورے ہندوستان پر قبضہ رکھنا بڑی ذمہ داری کا کام سمجھا گیا اور ریاستوں کے بقا کو ضروری قرار دیا گیا۔ علاوہ اس کے لارڈ ڈلہاوزی نے ریاستوں کو فنا کر کے برطانوی ہند میں شامل کر لینے کی جو پالیسی اختیار کی تھی اس کا نتیجہ اچھا نہ نکلا، عوام ناراض ہو گئے اور کہا جاتا ہے کہ غدر کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی تھا۔ چنانچہ بغاوت فرو کرنے کے بعد لارڈ کیننگ نے ۱۸۶۰ء میں جو ڈسپیچ لندن روانہ کیا اس میں یہی لکھا گیا تھا کہ ریاستوں کو برطانوی ہند میں شامل کرنا مناسب نہیں ہے بلکہ ان کا باقی رہنا ہی مفید ہے اور اس کے ثبوت میں انھوں نے بتایا کہ بغاوت کے دوران میں ریاستوں نے حکومت کی کتنی مدد کی

لیکن اب نہ لارڈ ڈلہاوزی کا زمانہ ہے نہ لارڈ کیننگ کا۔ حالات بالکل بدل گئے ہیں شخصی حکومتیں فنا ہو رہی ہیں، جمہوریت و ڈیماکریسی سے بڑھکر اشتراکیت کی طرف دنیا کا میلان بڑھتا جا رہا ہے، ایک عام بیداری ہر طرف نظر آ رہی ہے، ملکی و وطنی جذبات قوی ہوتے جا رہے ہیں اور سیاسیات یوروپ نے اب اس کا امکان بالکل باقی نہیں رکھا کہ کوئی حکومت رعایا کی عام آواز کی مخالفت کر کے چین سے بیٹھ سکے، اس لئے اگر ریاستیں ایک صدی پیچھے ہٹ کر اس مسئلہ پر غور کرنا پسند کرتی ہیں تو وہ کبھی اسمیں کامیاب نہیں ہو سکتیں ان کو سمجھنا چاہیئے کہ حکومت بالادست رفتہ رفتہ کس طرح ان کے اختیارات سلب کرتی جا رہی ہے اور وقت و زمانہ کے مطالبہ کے مقابلہ میں خود حکومت اپنے اقتدار کو بھی آہستہ آہستہ کھوتی جا رہی ہے، اس صورت میں یہ توقع کرنا کہ پھر وہی اگلا سا دور ملوکیت واپس آجائے خواب و خیال ہے اور اگر ریاستیں یہ چاہتی ہیں کہ وہ ہندوستان کے دوسرے حصوں

سے بے نیاز رہکر اپنے حدود کے اندر جو چاہیں کریں تو اب یہ بالکل ناقابل عمل ہے، ان کو دیکھنا ہوگا کہ زمانہ کیا چاہتا ہے، ان کو سمجھنا ہوگا کہ سیلاب کا رُخ کیا ہے اور ان کو اُسی طوفان میں پڑکر ساحل تلاش کرنا پڑے گا جس نے اسوقت نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کو گھیر لیا ہے

اگر ہندوستان کا نظام حکومت وفاقی صورت اختیار کرنا چاہتا ہے تو یہ ہوکر رہے گا اور کوئی قوت اس کی مخالفت میں کامیاب نہیں ہوسکتی - ہرچند ریاستوں کے لئے وفاق میں شرکت لازم نہیں ہے لیکن اسی کے ساتھ حالات ایسے ہیں کہ جلد یا بدیران کو شریک ہونا پڑے گا اور وہ ریاستیں جو اسوقت پس وپیش کر رہی ہیں ان کو بجائے پانے کے کچھ کھوکر شریک ہونا پڑے گا

میں پہلے کسی مضمون میں ظاہر کرچکا ہوں کہ قیام وفاق کے لئے جتنی ریاستی آبادی یا ریاستی نمائندگی کی ضرورت ہے وہ ان ریاستوں کی شرکت سے پوری ہوجائے گی جو فی الحال اپنی خودمختاری کو کھو بیٹھی ہیں یا جن میں قوتِ بالادست کے فیصلہ کے خلاف زبان ہلانے کی ہمت نہیں - اس لئے اگر بعض بڑی بڑی ریاستیں شریک نہ ہوئیں تو وفاق کو کوئی نقصان نہ پہونچے گا لیکن خود ان کی ہستی ضرور خطرہ میں پڑجائے گی

اول تو سب سے بڑا نقصان یہ پہونچے گا کہ پورا ملک اُن کا مخالف ہوجائے گا اور یہ ایسی زبردست اخلاقی ضرب ہوگی کہ اس کا متحمل ہونا آسان کام نہیں، علاوہ اس کے چونکہ یہ بات ریاستوں کے اختیار سے بالکل باہر ہے کہ وہ برطانوی ہند کے انقلابات سے اپنی رعایا کو متاثر نہ ہونے دیں اس لئے اگر وفاق سے الگ رہنے کے بعد کوئی اندرونی کشمکش پیدا ہوئی تو پھر نہ حکومت وفاق ان کی مدد کرے گی اور نہ تاج ان کی حمایت پر آمادہ ہوگا

تیسری بات جو سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے یہ ہے کہ شرکتِ وفاق کے بعد وہ حکومت کے محکمۂ سیاسیات کی گرفت سے آزاد ہوجائیں گی اور چونکہ بصورتِ شرکتِ وفاق ان کے معاملات پر وفاقی حیثیت سے غور کیا جائے گا اس لئے بہت ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں وہ برطانوی ہند کی ہمدردی بھی حاصل کرسکیں اور موجودہ حالت کے مقابلہ میں وہ زیادہ آزادی سے سانس لے سکیں

نگار کا غالب نمبر

جو جنوری ۳۲ء میں شایع ہوا تھا اب اُس کی چند کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں - نگار یوں بھی تمام رسایل میں جو ممتاز حیثیت رکھتا ہے وہ محتاج بیان نہیں نہ کہ غالب ایسے بلند پایہ اور شوخ نگار شاعر کے مطائبات پر تنقید و تبصرہ، یوں سمجھئے کہ - حسن اُس پر یوش کا اور پھر بیاں اپنا - اس کی قیمت رعایتی ۱۲ ہے علاوہ محصول

مینجر نگار لکھنؤ

شیخ امام بخش ناسخ

(پروفیسر فراق گورکھپوری کی تقریر جو ۱۹ اپریل ۱۹۳۸ء کو ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے نشر ہوئی)

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعری ہو یا زندگی کا کوئی اور کام، کسی بات میں کچھ لوگ اوروں سے بہت آگے بڑھ جاتے ہیں اور اس لئے وہ بڑے آدمی خیال کئے جاتے ہیں مگر کچھ لوگ بڑے آدمی ہوتے ہیں اور اس لئے وہ کسی بات میں اوروں سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مثلاً میر، آتش، انیس کے کلام کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ محض بڑے شاعر نہیں تھے بلکہ غیر معمولی آدمی بھی تھے۔ یہ لوگ زبردست مفکر تھے، قوم کے رہبر تھے اور اگر شاعری نہ بھی کرتے یا کچھ بھی نہ کرتے تو بھی اپنے ہمعصروں میں انکی ہستیاں اوروں سے بلند مانی جاتیں۔ کارلائل کا قول ہے کہ ایک ہیرو ہر طرح سے ہیرو ہوتا ہے (a hero is a hero at all points) وہ کہتا ہے کہ شیکسپیر اگر زبردست ڈراما نویس نہ ہوتا تو ایک زبردست سپاہی ہوتا۔ اُردو کے مشہور شاعروں میں میر اور سودا میں غالب اور ذوق میں انیس اور دبیر میں، ناسخ اور آتش میں غور کیجئے کہ کون محض بڑا فن کار تھا اور کون واقعی بڑا آدمی تھا۔ میں یہ سوال پیش کر کے خاموش ہو جاتا ہوں اور فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں

فیصلہ آپ جو کچھ بھی کریں لیکن ناسخ کا نام آتے ہی کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کرنا اور لیڈری کرنا ناسخ کا پیدائشی حق تھا۔ ناسخ مفکر نہ سہی، حقیقی معنوں میں زبردست شاعر بھی نہ سہی اس کی تمام توجہ تمام کوشش اور تمام زندگی نذر فروعات سہی لیکن وہ کسی ماحول، کسی ملک، کسی طبقے اور کسی زمانہ میں ہوتا، تو بھی اس کی ہستی غیر معمولی ہستی مانی جاتی اور اس کی شخصیت کو نظر انداز کرنا آسان نہ ہوتا۔ بحیثیت شاعر کے آج آپ ناسخ کو جو چاہیں کہیں اُس کے دو دیوان دیکھ کر اُردو شاعری پر اس کے اثر کو دیکھ کر آپ اُس کے تخلص کو تخریبی چیز سمجھیں یا تعمیری چیز، لیکن اس کی شخصیت میں وہ تیور ہے جو اُردو کے تمام مشاہیر میں نہیں صرف میر کی یاد دلاتا ہے۔ بحیثیت شاعر کے نہیں بلکہ بحیثیت ایک انسان کے ناسخ کو میر کا مزاج ملا تھا۔ اس کے علاوہ ناسخ کی شخصیت میں ایک ڈپٹ ہے ایک تحکمانہ انداز ہے ایک کس بل ہے جو غالباً کیا یقیناً میر کی شخصیت میں بھی نہیں ہے۔ انگریزی ادب کی تاریخ میں ناسخ کی شخصیت بن جانسن اور ڈاکٹر

سیمویل جانسن کی یاد دلاتی ہے۔ یہ تین کے تینوں جسمانی حیثیت سے پہلوانانِ سخن تھے اور اقلیم سخن کے حکمران تھے۔ تینوں ڈکٹیٹر تھے۔ تینوں کے کارناموں اور اثرات میں جیسے کوئی مادی طاقت یا مرعوب کُن جسامت کام کر رہی ہو، تین کے تینوں جسم، دل و دماغ علمیت اور کلام کے لحاظ سے ٹھوس آدمی تھے۔ اگر آپ ان تینوں سے بہت ناخوش ہیں تو بجائے ٹھوس کے ٹھس کہہ لیجئے۔ لیکن ان کا ٹھوس ہونا یقینی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ناسخ کی شاعری کے بارے میں کہا گیا ہے کہ کوہ کندن و کاہ برآوردن۔ کاہ یعنی گھاس کتنی ہی بے حقیقت چیز ہو لیکن کوہ کنی ذرا ٹھوس کام ہے۔ بہرحال اگر میر کی نازک دماغی مسلم ہے اور آتش کا بانکپن، تو ناسخ کا ٹھوس ہونا بھی تسلیم کرنا پڑے گا

ذرا غور کیجئے۔ شیخ امام بخش ناسخ زندگی اور شاعری دونوں میں یتیم تھے۔ باپ کا نام خدا بخش تھا۔ وطن لاہور تھا، زمانہ کی گردش نے باپ سے وطن چھوڑوایا اور عالم غربت میں فیض آباد کا منھ دکھایا جہاں ناسخ پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ ناسخ خدا بخش کے بیٹے بھی نہیں تھے بلکہ متبنّیٰ تھے۔ خدا بخش کے مرنے کے بعد بھائیوں نے دعویٰ کیا کہ امام بخش کوئی نہیں ہوتے اور خدا بخش کی کل دولت انھیں ملنی چاہئے۔ مگر ناسخ کی خود اعتمادی دیکھئے کہ انھوں نے کہدیا کہ مجھے مال و دولت سے کچھ غرض نہیں جس طرح ان کو باپ سمجھتا تھا آپ کو سمجھتا ہوں۔ اتنا ہے کہ جس طرح وہ میری ضروریات کی خبر گیری کرتے تھے اس طرح آپ فرمائیے۔ انھوں نے قبول کیا۔ کہا جاتا ہے کہ جایداد کے جھگڑے میں بدنیت چچا نے بیسنی روٹی اور گھی میں ناسخ کو زہر دیا۔ لیکن یہ زہر کارگر نہ ہوا۔ کچھ پیش نہیں جاتی ہے قسمت کے دھنی سے۔ عمر بھر کسی کی نوکری نہیں کی۔ پہلی دفعہ جب الہ آباد آئے راجہ چندو لال نے ۱۲ ہزار روپے بھیج کر بلا بھیجا۔ انھوں نے لکھ بھیجا اب جاؤں گا تو لکھنؤ ہی جاؤں گا۔ راجہ موصوف نے پھر خط لکھا بلکہ ۱۵ ہزار روپے بھیجکر بڑے اصرار سے کہا کہ یہاں تشریف لائیے گا تو ملک الشعرا خطاب دلوادوں گا، حاضری دربار کی قید نہ ہوگی ملاقات آپ کی خوشی پر رہے گی۔ انھوں نے منظور نہ کیا۔ پھر سنئے کہ غازی الدین حیدر کے عہد میں جب ان کی تعریفوں کا آوازہ بہت بلند ہوا تو انھوں نے کہلوایا کہ اگر شیخ ناسخ ہمارے دربار میں آئیں اور قصیدہ سنائیں تو ہم انھیں ملک الشعرا خطاب دیں۔ جب یہ پیغام ان کے شاگرد نواب معتمد الدولہ نے پہونچایا تو ناسخ نے بگڑکر جواب دیا کہ مرزا سلیمان شکوہ بادشاہ ہو جائیں تو وہ خطاب دیں۔ ان کا خطاب لیکر میں کیا کروں گا۔ غازی الدین حیدر ذرا خطرناک آدمی تھے۔ ناسخ کو لکھنؤ چھوڑکر غربت اختیار کرنی پڑی لیکن غازی الدین حیدر کے دربار میں نہ گئے اور اُن کے لئے یا کسی کیلئے عمر بھر کوئی قصیدہ نہ کہا حالانکہ کچھ نقادوں کو اس کی حسرت رہ گئی کہ ناسخ قصیدہ کی طرف مایل ہوتے۔ اُردو شعرا پر جو بہل پسندی سے یہ حکم لگا دیا جاتا ہے کہ وہ لالچی، خوشامدی، دربار پرست اور ثروت پرست ہوتے ہیں یا ہوتے تھے وہ تصویر کا محض ایک رُخ ہے اور وہ بھی سب سے زیادہ نظر فریب اور دلکش رُخ نہیں ہے۔ مجھے تو اُردو شاعروں کی دنیا پرستی میں بھی ایک لطیف عنصر ملتا ہے۔ ناسخ کا دل کتنا بڑا تھا اس کی ایک جھلک تو ہم آپ نے دیکھ لی۔ اب دیکھئے کہ شاعری میں بھی کس انداز سے بے یار و مددگار شخص اپنی دھاک بٹھا کر رہا اور دہلی [redacted] لکھنؤ تک بلکہ براعظم ہند کے اس تمام حصہ پر چھا گیا جہاں

ہندوستانی زبان بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ ناسخ کی شاعری کس طرح شروع ہوئی اس کا حال مصنفِ آبِ حیات سے سنئے
"شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ روایت ہے کہ ایک بار ناسخ نے آغازِ شاعری کا حال یوں بیان فرمایا کہ میر تقی مرحوم ابھی زندہ تھے جو مجھے ذوقِ سخن نے بے اختیار کیا۔ ایک دن اغیار کی نظر بچا کر کئی غزلیں خدمت میں لے گیا۔ انھوں نے اصلاح نہ دی۔ میں دل شکستہ ہو کر چلا آیا اور کہا کہ میر صاحب بھی آخر آدمی ہیں۔ فرشتہ تو نہیں۔ اپنے کلام کو آپ ہی اصلاح دوں گا۔ چنانچہ عرصہ کے بعد پھر فرصت میں نظرِ ثانی کرتا اور بناتا۔ غرض مشق کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ لیکن کسی کو سناتا نہ تھا۔ جب تک خوب اطمینان نہ ہوا مشاعرہ میں غزل نہ پڑھی۔ نہ کسی کو سنائی۔ مرزا حاجی صاحب کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ سید انشا۔ مرزا قتیل۔ جرأت۔ مصحفی وغیرہ سب شعرا جمع ہوتے تھے سب کو سنتا تھا مگر وہاں کچھ نہ کہتا تھا۔ ان لوگوں میں جو لوں، مرچ سید انشا اور جرأت کے کلام میں ہوتا تھا وہ کسی کی زبان میں نہ تھا۔ غرض سید انشا اور مصحفی کے معرکے بھی ہو چکے جرأت اور ظہور اللہ خاں نوا کے ہنگامے بھی طے ہو گئے۔ جب زمانہ سارے ورق اُلٹ چکا اور میدان صاف ہو گیا تو میں نے غزل پڑھنی شروع کی"۔ گلستاں کی وہ روایت تو شاید آپ کو یاد ہو گی جس میں ایک شاعر شیخ سعدی کے پاس آکر بدہضمی کی شکایت کرتا ہے۔ سعدی نے کہا کہ تو نے کوئی شعر کہا ہو گا اُسے سنا۔ اس نے سنایا اور وہ شعر سعدی نے اس سے تین بار پڑھوایا اور پھر کہا کہ جا اب تیری بدہضمی دور ہو گئی۔ ناسخ نے نوجوانی میں دن رات شعر کہتے ہوئے بھی جس صبر و استقلال، جس خود اعتمادی، سیر چشمی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا ہے اُسے آپ نے دیکھا۔ اگر یہ قوتِ ارادی اور قوتِ انتظار کسی عاشق کو نصیب ہو تو شاید حسنِ بے نیاز کی تمکنت بھی ڈانواں ڈول ہو جائے۔ لیکن دل و دماغ کے اُبھار کو اتنے دنوں تک دبائے رہنے کے لئے شعر کہہ کر اُسے پی جانے کے لئے شاعری کے ہنگاموں میں لب پر مہرِ سکوت لگا لینے کے لئے بڑے ٹھوس کردار بڑے سخت قوت ہاضمہ کی ضرورت ہے

اب آزاد ہی کی زبان سے ناسخ کے کچھ اور حالات سنئے۔ کہتے ہیں "ابتدائے عمر سے ورزش کا شوق تھا۔۔۔۔ ۱۲۹، ڈنٹر کا معمول تھا کہ یا غفور کے عدد ہیں۔ یہ وظیفہ قضا نہ ہوتا تھا۔ البتہ موقع اور موسم پر زیادہ ہو جاتے تھے۔ جیسا ریاضت کا شوق تھا ویسا ہی ڈیل ڈول بھی لائے تھے۔ بلند بالا۔ فراخ سینہ۔ منڈا ہوا سر۔ کھاروے کا لنگ باندھے بیٹھے رہتے تھے۔ جیسے شیر بیٹھا ہے۔ جاڑے میں تنزیب کا کرتا۔ بہت ہوا تو لکھنؤ کی چھینٹ کا دھرا کرتا پہن لیا۔ دن رات میں ایک دفعہ کھانا کھاتے تھے۔ ظہر کے وقت دسترخوان پر بیٹھے تھے اور کئی وقت کی کسر نکال لیتے تھے۔۔۔۔ دسترخوان اُٹھتا تھا تو دو خوان فقط خالی برتنوں کے بھرے اُٹھتے تھے۔ قوی ہیکل بلونت جوان تھے۔ ان کی صورت دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ۴۔ ۵ سیر کھانا ان کے آگے کیا مال ہے"۔

"یہ بھی معمول تھا کہ پہر رات رہے سے ورزش شروع کرتے تھے۔ صبح تک اس سے فارغ ہوتے تھے۔ مکان مردانہ تھا۔ عیال کا جنجال رکھا ہی نہ تھا۔ اول نہائے اور پھر صحن میں کہ صفائی سے آئینہ رہتا تھا مونڈھے بچھے ہیں،

اندر ہیں تو فرش اور سامان آرائش سے آراستہ ہے۔ صبح سے احباب اور شاگرد آنا شروع ہوتے تھے۔ دوپہر کو سب رخصت اور دروازہ بند۔۔ عصر سے پھر آمد شروع ہوئی۔ مغرب کے وقت سب رخصت۔ خدمتگار کو بھی باہر کیا اور اندر سے قفل بند کر دیا کوٹھے پر ایک کمرہ خلوت کا تھا۔ وہاں گئے کچھ سو رہے اور تھوڑی دیر بعد اُٹھکر فکر سخن میں مصروف ہوئے۔ عالم خواب غفلت میں پڑا سوتا تھا اور وہ خواب راحت کے عوض کاغذ پر خون جگر ٹپکاتے تھے"

"آداب محفل کا بہت خیال تھا۔ آپ تکیہ سے لگے بیٹھے رہتے تھے۔ شاگرد باادب بچھونے کے حاشیہ پر بیٹھتے جاتے تھے۔ دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ شیخ صاحب کچھ سوچتے کچھ لکھتے۔ جب کاغذ ہاتھ سے رکھتے تو کہتے ہوں! ایک شخص غزل سنانی شروع کرتا" اور یہ اصلاح دیتے جاتے۔

یہ تو تھا ناسخ کا معمول زندگی۔ میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ ناسخ کی شخصیت ہمیں میر کی یاد دلاتی ہے۔ دونوں بے انتہا نازک مزاج تھے یا ٹھیٹ زبان میں دونوں نہایت جھکی تھے۔ مگر میر کی جھک اور نازک مزاجی اور ناسخ کی جھک اور نازک مزاجی میں بڑا فرق ہے۔ میر کے بارے میں جو روایتیں مشہور ہیں وہ تلخ اور ناگوار ہوتے ہوئے بھی ایک لطیف اور تیز معنویت رکھتی ہیں اور میر کے مزاج کی شعریت، میر کی شاعری اور میر کے متعلق ان روائتوں میں ایک نازک مطلب اور ہم آہنگی ہے:۔

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا　　اس کی ہر بات اک مقام سے ہے

لیکن ناسخ کی جھک اور نازک مزاجی ذرا مزاحیہ یا کامک قسم کی ہے مثلاً دوران فکر میں ایک دیرینہ دوست کا ناسخ سے ملنے آنا اور ٹال مٹول کے بعد بھی جب وہ نہ اُٹھے تو گھر میں آگ لگا دینا۔ کسی رئیس زادے کا ان کے یہاں آکر شیشے کے چجون سے کھیلنا اور جب ایک چمچ اتفاق سے ٹوٹ گیا تو دوسرا یہ کہکر پیش کر دینا کہ اب اس سے شغل فرمائیے۔ دوران فکر سخن میں ایک پاس بیٹھے ہوئے شخص کا ایک تنکا توڑتے رہنا اور ناسخ کا ملازم کو یہ حکم دینا کہ ایک ٹوکری خس و خاشاک ان کے پاس لاکر ڈال دے۔ ایک فارسی شعر کا مطلب دریافت کرنے پر یہ کہکر کہ میں فارسی کا شاعر نہیں دوسروں سے باتیں کرنے لگنا اور پوچھنے والے کا نادم واپس آنا۔ شعر سنانے کی فرمائش کرنے پر بالکل مہمل اور بے معنی شعر سنا کر یہ دیکھنا کہ یہ شخص کچھ سمجھتا بھی ہے یا یونہی تعریف کرنے آیا ہے، یا اپنے دیوان کی نقل پیش کر دینا کہ ملاحظہ کر لیجئے، یہ تمام لطائف و ظرائف نہ صرف ناسخ میر کے رنگ طبیعت کے فرق کو نمایاں کرتے ہیں بلکہ دہلی کے مزاج شاعری میں جو داخلی پہلو ہے اور لکھنؤ کے مذاق میں جو خارجی پہلو ہے اس فرق کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ میر اور ناسخ دونوں کو خبط سہی —— ہر کس بخیال خویش خبطے دارد۔

لیکن ناسخ کی شخصیت سے بڑھکر جب ہم ناسخ کی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو تاریخ ادب کی اس ستم ظریفی کی مثال ہمارے سامنے آتی ہے جس کی بدولت شاعری کا ریفارم کرنے والا حقیقی معنوں میں شاعر ہو ہی نہیں سکا۔ مثلاً میں یہ تو نہیں کہتا کہ اُردو ادب میں سودا شاعر نہیں لیکن اصلاح زبان اور اصلاح ادب میں سے اس نے زیادہ کی پھر بھی غزل میں کہاں

میر کہاں سودا، انگریزی ادب میں بن جانسن کی اُستادی مسلم پھر بھی بغیر کاٹ چھانٹ کے کلام شیکسپیر وہ صحرائے خودرو ہے جس کی قوت نمو کے سامنے بن جانسن کی باغبانی دہری رہ جاتی ہے۔ یہی حال ناسخ اور آتش، انیس اور دبیر، داغ اور امیر کا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ناسخ پیدائشی لیڈر اور ڈکٹیٹر تھا۔ اس نے سختی سے تکمیل کے ساتھ اور جرزسی کے ساتھ اُردو زبان کو منضبط اور منظم کیا اور ہمیشہ کے لئے زبان اور بیان کی بدنظمیوں کو مٹا دیا اور اس معنے میں کہ جتنا بڑا کلیسکس (Classics) دیوان ناسخ ہے، آج تک اُردو کا کوئی اور دیوان نہیں ہو سکا۔ جس طرح آگسٹس (Augustus) نے روم کو اینٹ کا پایا اور اُسے سنگ مرمر کا بنا کر چھوڑا اسی طرح جہاں تک زبان، بیان اور شاعری کے خارجی اُصولوں اور میونسپل قانونوں کا تعلق ہے ناسخ نے اقلیم غزل کو ایک خودرو جنگل پایا اور اسے کم از کم ظاہری شکل وصورت کے لحاظ سے ایک وسیع البسط باغ بنا کر چھوڑا۔ شاعرانہ حیثیت سے نہ سہی لیکن تاریخی حیثیت سے یہ معمولی کارنامہ نہیں۔ لوگ یہ اکثر بھول جاتے ہیں کہ دیوانِ ناسخ سے پہلے جو اُردو دیوان مرتب ہوئے تھے ان میں سب سے مشہور دیوان میر۔ دیوان سودا، اور جرأت، مصحفی اور انشا کے دیوان ہیں۔ ان دواوین کے مرتب ہونے کے پچاس برس کے اندر اندر دیوان ناسخ مرتب ہوا۔ لیکن مقابلہ کر کے دیکھئے تو دیوان ناسخ کی زبان میں اور ان کے بزرگ ہمعصروں کی زبان میں ایک صدی کیا شاید کئی صدیوں کا فرق نظر آئے گا۔ کہا جاتا ہے کہ جب پہلے پہل دیوان ناسخ کی کچھ جلدیں دہلی پہونچیں تو غالب، مومن، ذوق اور دوسرے اُستادوں نے کہا کہ ابتک جو انداز بیان رائج تھا اس کی آخری گھڑی آگئی ہم سب کو اب اسی نئے رنگ میں کہنا ہے۔ شیفتہ ایسا اہلِ نظر ایسا مرعوب ہوا کہ بمقابلہ آتش کے ناسخ کے یہاں اسے زیادہ نشتر نظر آئے

بحیثیت ادبی ڈکٹیٹر کے تو ناسخ کا ثانی کوئی ہوا ہی نہیں اور اب سے سو برس پہلے کے مغرور ہندوستان سے کسی کو خاطر میں نہ لانے والے لکھنؤ سے کمزور ہستیوں کی گت بنا دینے والے لکھنؤ سے اپنا لوہا منوا لینا جیسا میں کہہ چکا ہوں بڑی ٹھوس شخصیت کا کام تھا۔ اب بحیثیت شاعر کے اگر دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ نہایت ثقیل الفاظ استعمال کرتے ہیں، صفائی کے کوچے میں آتے ہیں تو اکثر چبھتی پر اُتر آتے ہیں، ناجایز تصرفات بھی کر جاتے ہیں، کبھی کبھی غلط محاورہ بھی استعمال کر جاتے ہیں۔ عموماً خیال بندی کرتے ہیں اور ان کی اکثر نازک خیالیاں کوہ کندن اور کاہ برآوردن کا مصداق ہوتی ہیں اور مصنف کاشف الحقایق نے بالکل صحیح رائے دی ہے کہ "وہ خیالات ناسخ کی بدولت بڑی کثرت سے احاطۂ غزل گوئی میں داخل ہو گئے جو درحقیقت احاطۂ غزل سرائی سے باہر ہیں۔ اس زور آزمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ واردات وجذبات قلبیہ اور دیگر امور ذہنیہ کے مضامین سے شیخ کی غزلیں معرا ہو گئیں اور غزل سرائی کا مطلب فوت ہو کر ایک ایسی قسم کی شاعری ایجاد ہو گئی جس پر قصیدہ گوئی اور غزل سرائی دونوں سے کسی کی تعریف صادق نہیں آتی"۔

خیر یہ تو صحیح ہے کہ ناسخ نے غزل کو نہ غزل رکھا نہ قصیدہ رکھا بلکہ ایک معجونِ مرکب بنا دیا لیکن اس کے اشعار کی بلند آہنگی، انداز بیان کی تکمیل، بندش کی چستی، مصرعوں کا کس بل اور زور وہ چیزیں ہیں جو اس پہلوان سخن کے ۱۲۹۷ ڈنٹر کا

اثر اس کی شاعری میں بھی نمایاں کر رہے ہیں۔ اس کے معنی اور مفہوم کو آپ سراسر تصنع کہیں لیکن جہاں تک منضبط اسلوب بیان کا تعلق ہے ناسخ کے احسان سے اور تو اور غالب، ذوق، مومن، آتش اور ناسخ کے بعد کے اُردو زبان کے تمام شعرا گراں بار ہیں۔ یہ بات شاید ہمیشہ صیغۂ راز میں رہے گی کہ غالب نے جو ایک بہت بڑا حصہ اپنے اُردو دیوان کا منسوخ کر دیا اس نظم و نسخ میں دیوان ناسخ کا بھی فیصلہ کن اثر پڑا تھا یا نہیں۔ لیکن مصحفی، انشا، جرأت کی زبان تو دور رہی کیا زبان کا جو اسلوب آج ہمارا جزو دماغ ہو چکا ہے وہ اسلوب وہ انداز بیان غالب، ذوق اور مومن کے مروجہ دواوین سے مرتب ہو سکتا ہے۔ غالباً نہیں۔ یہ تو ہوا زبان پر ناسخ کا عالمگیر اور مستقل اثر۔ اب رہی ناسخ کی شاعری سو اس کے محاسن و معائب کچھ تو عرض کئے ہی جا چکے۔ لگے ہاتھوں یہ بھی کہہ دوں کہ باوجود تصنع اور مبالغہ کے اور باوجود آج سے سو برس پہلے کا لکھنوی شاعر ہوتے ہوئے بھی ابتذال سے جتنا ناسخ کا کلام پاک ہے اتنا آتش کا بھی نہیں۔ تصنع اور خارجیت اس میں شک نہیں ناسخ کے یہاں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں لیکن ناسخ کے انداز بیان میں جو صفات ہیں وہ کامیاب داخلی شاعری کے لئے کہاں تک کارآمد ہو سکتے ہیں یا داخلی شاعری کی جھلک کہاں تک دکھا سکتے ہیں اس پر شاید بہت کم غور ہمارے نقادوں نے کیا ہے کیا آتش نے جہاں کھلی ہوئی تقلید ناسخ کی کی ہے اس کے علاوہ اپنے داخلی اور کامیاب کلام میں وہ ناسخ سے متاثر نہیں۔ امیر مینائی کا پہلا دیوان مراۃ الغیب ناسخ کے اسلوب سے پورا پورا فیضیاب ہوتا ہوا خارجی اور تمثیلی شاعری میں بھی ایک دلکش داخلی پہلو لئے ہوئے ہے اور ناسخ کے خاندان ہی میں حضرت آسی غازی پوری شاگرد رشک نے تو اپنے یہاں ناسخ کی آواز سے میر اور غالب کی آواز ملا دی ہے۔ ناسخ کی زبان میں میر کے رنگ کا حضرت آسی کا صرف ایک شعر سنئے:۔

کوچۂ زلف صنم میں اہل دل جاتے ہیں کیوں　　اور جاتے ہیں تو دل سی چیز کھو آتے ہیں کیوں

آخر مثنوی گلزار نسیم تو خاندان آتش کی چیز ہے لیکن تصنع اور تکلف جس انداز سے یہاں دلوں میں چٹکیاں لے رہے ہیں اُسے کیا کہا جائے۔ کیا اس مثنوی پر ناسخ کی تحریک کا اثر نہیں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ ناسخ پورے ہندوستان پر چھا گیا تھا اور اسکے حریف بھی اس کا اثر لئے بغیر نہ رہے۔ ناسخ کی شاعری اور شخصیت ایک شگون کا حکم رکھتی ہے۔ ناسخ کے شاگردان رشید اور براہ راست مقلد وزیر، رشک، قلق وغیرہ کے کلام کو آپ جو کچھ کہیں لیکن اسی خاندان میں تعشق لکھنوی اور جلال لکھنوی نے جو زبان ناسخ میں نشتریت بھر دی ہے اُسے آپ کیا کہیں گے۔ اس سلسلہ میں ایک ایسا نام یاد آیا کہ میں خود چونک گیا۔ آج حسرت موہانی کی فارسی ترکیبوں میں مومن، معاملہ بندی میں جرأت، تشکیل بیان، رنگینی اور البیلے پن میں مصحفی کی آواز بازگشت ہم سنتے ہیں لیکن ان کی چست و چاق بندشیں اور اسلوب و زبان کی حیرت انگیز پختگی اگر ناسخ کی دین نہیں ہیں تو کس کی دین ہیں سب سے کامیاب پیروی ذرا کتراکے کی جاتی ہے۔ بہر حال ناسخ کا کلام چٹان کی طرح ٹھوس سہی لیکن یہ چٹان اتنی خشک و بے فیض نہیں کہ ٹھوکر ماریں تو اُس سے صاف شفاف اور ٹھنڈے چشمے بھی نہ ابل پڑیں

خود ناسخ اپنے رنگ کے فروعاتی عنصروں سے گزر کر دیکھئے کیسے کیسے شعر کہتا ہے:۔

شب فرقت میں شمع کا کیا ذکر
زندگی کا چراغ بھی گل ہے

عشق جب کامل ہوا ہے عین حسن
آگ میں پڑ جائے جو شے آگ ہے

روٹھے ہوئے تھے آپ کئی دن سے من گئے
بگڑے ہوئے تمام مرے کام بن گئے

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں،
ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

شب فراق گئی روز وصل آپہونچا
طلوع صبح ہے عالم تمام روشن ہے

تیرے نظارہ سے ہو جاتی ہے کیا خاطر جمع
چھوڑ دیتا ہے پریشاں نظری آئینہ

جنوں پسند ہوا ہے مجھے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

دل کو خوش آتی ہیں صحرا کی ببولیں پرخار
اب کسی سرو گل اندام سے کچھ کام نہیں،

تمام عمر یونہی ہو گئی بسر اپنی،
شب فراق گئی روز انتظار آیا

زاہد وہ بادہ کش ہوں کہ مانگوں اگر دعا
اٹھیں ابھی شراب سے بادل بھرے ہوئے

آتی جاتی ہے جا بجا بدلی،،
ساقیا جلد آ ہوا بدلی،،

آب حیواں پیوں بجائے شراب
ایسی اے خضر مجھ کو پیاس نہیں

چلا عدم سے میں جبراً تو بول اٹھی تقدیر
بلا میں پڑنے کو کچھ اختیار لیتا جا

تمام صفحۂ عالم ہے ایک ہی صفحہ
سر کتاب کا یہ اک ورق تمام نہیں

عشق سے کس کے دل کو لاگ نہیں،
کون سا گھر ہے جس میں آگ نہیں

ایسے اشعار کہنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ یہ وہ اشعار ہیں جنھیں میر، غالب اور اقبال بھی اپنے مجموعے میں شامل کرنا باعث فخر سمجھتے۔ ناسخ اگر چاہتا تو ایسے اشعار کی ایک بہت بڑی تعداد کہہ ڈالتا لیکن وہ آیا تھا زبان کو سنوارنے، میں نے سر۔ صرف زبان کا ہو کر رہ گیا اور شاعری کو بھول گیا۔

آئندہ جنوری ۳۹ء کا نگار

مصحفی نمبر ہوگا۔ اس سلسلہ میں نگار کے جو خاص نمبر شایع ہو چکے ہیں وہ اتنے زیادہ مقبول اور اپنی جامعیت وافادیت کے اعتبار سے اتنے مکمل تھے کہ بعض پرچوں کی فرمایشیں اسوقت تک آتی رہتی ہیں۔ چنانچہ اس نمبر کی ترتیب بھی اسی پیمانہ پر ہو رہی ہے۔ پھر نگار کو اس خصوصیت میں ہندوستان کے رسایل میں جو امتیاز حاصل ہے وہ آپ سے مخفی نہیں۔ تفصیل آیندہ پرچے میں ملاحظہ فرمایئے۔

منیجر نگار لکھنؤ

سیاسیات یوروپ

(۴)

مسولینی

"میں، خود اپنی زندگی کو ایک شاہکار بناؤں گا"۔۔۔مسولینی

مسولینی، طوفانی مزاج مسولینی، جدید رومہ کا خالق اور جنگ حبش کا مصنف، ۲۹ جولائی ۱۸۸۳ء کو رومیگنا (Romagna) کے ایک گاؤں ڈوویاڈی پری ڈیپیو (Dovia de Predappio) میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی زندگی بالکل وہی ہے جو ایک انقلاب پسند خود سر لیکن انتہائی زیرک انسان کی ہونی چاہئے۔ مسولینی کا باپ لوہار تھا اور انقلاب پسند۔ لیکن خود مسولینی کی زندگی میں کوئی خاص واقعہ ایسا نظر نہیں آتا جو زندگی میں اتنا زبردست انقلاب پیدا کر سکے

کہا جاتا ہے کہ نوجوانی میں مسولینی پر غالباً سوئٹزرلینڈ کی ایک روسی جلاوطن خاتون کا بہت زیادہ اثر پڑا جو غالباً مسولینی اور لینن کی اولین ملاقات کا باعث ہوئی

مسولینی ابتداہی سے بہت ذہین تھا اور اُس نے مارکس، ہیگل، میشی ولی، لاسلے، نٹزش، پریٹو اور سورل کی تصانیف بہت غور سے پڑھی تھیں

اس کی ابتدائی زندگی انتہائی عسرت کے عالم میں بسر ہوئی بیس برس کی عمر تک اُس نے کافی نہیں پی، سونے کے واسطے اُسے چٹائی بھی میسر نہ تھی

اگرچہ مسولینی کا باپ، لوہاری کا پیشہ کرتا تھا مگر اس کے آباواجداد، کاشتکار تھے۔ چنانچہ اکتوبر ۳۵ء میں مسولینی نے خود کسانوں کے ایک مجمع میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "بعض لوگوں نے جو پرانے کاغذات کی چھان بین کیا کرتے ہیں یہ خیال کیا کہ اگر انھوں نے مجھے کسی بڑے معزز خاندان کا فرد ثابت کر دیا تو میں بہت خوش ہو جاؤں گا۔ مگر میں نے ان کو

روکدیا۔ میرے دادا، پردادا سب کھیتی کرتے تھے اور میں نے پرانے فارم، پر یہ کتبہ لگوا دیا ہے کہ مجھ سے قبل مسولینی کا پورا خاندان اپنے ہاتھ سے کھیت جوتتا تھا"

بچپن میں، اپنی ماں کے اصرار سے (ہٹلر اور کمال کی طرح) مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ایک مذہبی درسگاہ میں داخل کیا گیا (اگرچہ اُس کا باپ اس تعلیم کے بہت خلاف تھا) اور اس کے بعد وہ خود اُس مدرسہ میں ملازم ہوگیا۔ ۱۹ برس کی عمر میں وہ سوئٹزرلینڈ بھاگ گیا۔ یہاں ایک فیکٹری میں وہ معماری اور مزدوری کرتا رہا۔ اس زمانہ میں وہ اکثر بھوکا رہا کرتا تھا۔ لیکن سوشلزم کی کتابوں کا مطالعہ کبھی ترک نہ ہوتا تھا۔ جب اُس نے سوئٹزرلینڈ کے انقلاب میں حصہ لینا شروع کردیا تو وہ کئی مرتبہ گرفتار ہوکر ایک شہر سے دوسرے شہر کو بھیجا گیا

مسولینی کو جیل اور جیل کی زندگی سے ہمیشہ نفرت رہی اور غالباً جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں رہنے ہی کا یہ ردعمل ہے کہ مسولینی کو وسیع کمروں کا بہت شوق ہے چنانچہ اس کے دفتر کا کمرہ ۶۰ فیٹ لانبا اور ۴۰ فیٹ چوڑا ہے

سوئٹزرلینڈ سے مسولینی ۲۱ برس کی عمر میں واپس آیا اور دس برس تک اُس نے یہاں ایک نہایت سرگرم سوشلسٹ کارکن کی حیثیت سے زندگی بسر کی

اس دوران میں اس کا ذریعۂ معاش معلمی اور صحافت تھی۔ مسولینی، برنارڈ شا یا ٹراٹسکی کی طرح پمفلٹ باز نہیں ہے مگر وہ دورِ حاضر کے بہترین صحافت نگاروں میں سے ہے۔ اُس کی سب سے پہلی تصنیف "پادری کی معشوقہ" (Cardinals Mistress) ہے۔ اُس نے جان ہس (John Huss) کی سوانح عمری بھی لکھی ہے ۱۹۰۹ء میں یہ مقام فورلی (Forli) اُس نے لارڈ ڈی کلاسی، (طبقہ دارانہ جنگ) نامی اخبار نکالا جسکی وجہ سے وہ اٹلی کے تمام انقلابیوں اور سوشلسٹوں میں مشہور ہوگیا۔ ۱۹۱۲ء میں وہ سوشلسٹ کے سرکاری آرگن 'اوانٹی' (Avanti) کا اڈیٹر مقرر ہوا اور تین ہی مہینہ میں اس کی اشاعت تگنی کردی۔ ۱۹۱۴ء میں "سرخ ہفتہ" منانے کے سلسلہ میں اس نے کافی حصہ لیا

جنگ عظیم نے اُس کے سوشلسٹ خیالات پر بہت اثر ڈالا۔ انتہا پسند سوشلسٹ چاہتے تھے کہ اٹلی، غیر جانبدار رہے مگر مسولینی اتحادیوں کی طرف سے جنگ کرنے کے موافق تھا۔ چنانچہ اس نے اوانٹی، کی ادارت سے استعفیٰ دیدیا اور سوشلسٹ جماعت سے اُسے خارج کردیا گیا۔ چند مہینوں کے بعد اُس نے پپولو ڈی اٹیلیا (Popolo d'Italia) نامی اخبار نکالا جس کا وہ ابھی تک نگراں ہے۔ چونکہ فرانس، اٹلی کو میدان کارزار میں لے آنا چاہتا تھا اس لئے فرانس نے اس موقع پر اُسے مالی امداد بھی دی۔ اس کے بعد سے مسولینی، جو ابھی تک جنگ کا بہت مخالف تھا، جنگ کا زبردست حامی بن گیا۔ ایک موقع پر اُس نے لکھا کہ جنگ جنگ میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ہم 'ممی' نہیں ہیں کہ عمر بھر خاموش بیٹھے رہیں ہم انسان ہیں اور تخلیق تاریخ میں ہم کو حصہ لینا چاہئے، مگر وہ خود ۱۹۱۶ء تک محاذ جنگ پر نہیں گیا اور اس کے بعد

جب گیا بھی تو تقریباً سوا مہینے کے بعد ہی ایک خندق میں بم پھٹ جانے سے زخمی ہوگیا اور سات مہینے تک اسپتال میں رہا
جنگ کے بعد، ۲۳ مارچ ۱۹۱۹ء کو اُس نے ایک جماعت کی بنیاد ڈالی جس کا نام Fasci di Combattimento) تھا، اُس میں زیادہ تر وہ لوگ شامل ہوئے جو شرکتِ جنگ کے مسئلہ میں اُسکے موید تھے۔ مسولینی ابھی تک سوشلسٹ تھا اور سرمایہ دارانہ استبداد کا سخت مخالف تھا

(Fascio) "فیسیو" کے معنے اطالوی زبان میں "جماعت" کے ہیں۔ فسطیوں کی یہ جماعت ابتدا میں کوئی "پارٹی" نہ تھی بلکہ ایک فوجی جماعت تھی اور اس میں زیادہ تر فوجی دالنٹیر شامل تھے۔ چنانچہ مسولینی نے اس جماعت کے بارہ میں لکھا تھا کہ ہم لوگ جو جنگ میں زندہ بچ گئے ہیں اور اپنے ملک واپس آئے ہیں اٹلی پر حکومت کرنا چاہتے ہیں

اس وقت اٹلی کی یہ حالت تھی کہ معزول سپاہی بے روزگار تھے اور جمہوری کابینہ بے حد کمزور، پارلیمنٹ میں سخت بدنظمی تھی اور قوم کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسولینی کی جماعت روز بروز طاقتور ہوتی گئی اور فوج نے اسکی تائید شروع کردی ۱۹۲۲ء میں مسولینی نے اپنا اقتدار تشدد کے ذریعہ سے بڑھانا شروع کیا (جس کی نقل بعد کو دوسرے ڈکٹیٹروں نے کی) اور وہ گویا ڈاکوؤں کے گروہ کا سرغنہ بن گیا۔ [illegible] مسولینی کے گروہ نے تقریباً نصف درجن شہروں میں اپنا اثر جمالیا اور ملک بھر میں ایک قسم کی خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ مسولینی ابھی تک سوشلسٹ ہونے کا دعویٰ کرتا تھا مگر طاقت حاصل کرنے کے لئے اُسے لڑنے کی ضرورت تھی اس لئے مزدوروں کو آزاد کرانے کے بہانہ سے جنگ شروع کردی اور جب اسے یقین ہوگیا کہ فوج اس کی مخالفت نہ کرے گی تو پچاس ہزار فسطائیوں کے ساتھ اس نے روم پر حملہ کرکے اپنا اقتدار قایم کرلیا

۱۹۲۲ء کے بعد سے مسولینی کی تاریخ سب پر ظاہر ہے۔ پہلے تو اس نے ایک اتحادی حکومت بنائی مگر دس برس کے بعد اُس نے غیر فسطیوں کو نکال دیا۔ ۱۹۳۵ء میں جنگ حبش سے قبل سب سے زیادہ نازک صورت نوجوان سوشلسٹ لیڈر میٹیوٹی (Matteotti) کے قتل سے پیدا ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ مسولینی، میٹیوٹی پر پارلیمنٹ میں بھی ناراض ہوا اور تخلیہ میں بھی اُس نے اس کا نام لیکر اپنے انتہائی غیظ و غضب کا اظہار کیا۔ اس پر اس کے آدمیوں کو خیال ہوا کہ ہمارا لیڈر چاہتا ہے وہ قتل کردیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے اس کو قتل کر ڈالا۔ اس قسم کے واقعات ایک ڈکٹیٹر کی طرف سے تعجب خیز نہیں ہیں۔ اور مسولینی نے نہایت جرأت سے اس قتل کی ذمہ داری اپنے سر لے لی اور کہدیا کہ قاتل فسطائی تھے اس قتل سے مسولینی کو صدمہ ضرور پہونچا مگر اس کے بعد وہ اپنے مخالفوں کا زور توڑنے میں جلد کامیاب ہوگیا

مسولینی بحیثیت انسان کے

مسولینی دراز قامت انسان نہیں بلکہ صرف ۵ فٹ ۶ انچ کا قد رکھتا ہے اس کے بازو مضبوط اور ہاتھ نرم ہیں۔ عموماً وہ فوجی لباس پہنتا ہے اور روم کے وسط میں رہتا ہے

مسولینی کی بیوی بھی کچھ عرصہ سے یہیں رہنے لگی ہے۔ اس کی ابتدائی زندگی کا حال نہیں معلوم ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ کسی ہوٹل میں ملازم تھی اور بعض کا خیال ہے کہ خود مسولینی کے باپ کی ملازمہ تھی۔ بہرحال اُس سے مسولینی کے پانچ بچے ہوئے ہیں

مسولینی ہی موجودہ ڈکٹیٹروں میں سب سے زیادہ صاحب اولاد ہے اُسے اپنی خانگی زندگی کا بھی بہت خیال ہے اُس کو اپنے بھائی آرنیلڈو، پر بڑا اعتماد تھا اور اس کی موت کا اسے بے انتہا صدمہ ہوا۔ اُس کی لڑکی اڈا، مسولینی کے مزاج میں بہت دخیل ہے اور اس کا شوہر کاؤنٹ گیلنزو کیانو، آج کل اٹلی کا وزیر خارجہ ہے

۵۳ برس کی عمر میں اب بھی مسولینی کافی تندرست ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ اپنے اوقات کا بہت پابند ہے وزیر اعظم ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ پیٹ کی درد کی بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ اب آج کل وہ پھل اور دودھ کے علاوہ بہت کم کھاتا ہے۔ اُس نے حال میں ایک امریکن اخبار نویس سے انٹرویو کے دوران میں پھلوں کی ایک ٹوکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میری تندرستی کا راز یہی ہے۔ صبح کو میں ایک پیالہ کافی اور پھل کھاتا ہوں، دوپہر کو شوربہ اور پھل اور رات کو پھر پھل استعمال کرتا ہوں، میں گوشت کبھی نہیں کھاتا البتہ کبھی کبھی تھوڑی سی مچھلی چکھ لیتا ہوں۔" مسولینی کو ورزش کا بہت شوق ہے۔ اس کے علاوہ گھوڑے کی سواری، شمشیر زنی اور تیراکی سے بھی اُسے کافی دلچسپی ہے۔ وہ نہ سگرٹ پیتا ہے اور نہ شراب۔ نوجوانی میں اُسے عورتوں سے ضرور دلچسپی تھی مگر چند سال سے اس طرف توجہ بہت کم کر دی ہے

مسولینی کی سوشل زندگی کچھ بھی نہیں ہے۔ جب اُسے سیاسی حیثیت سے کسی کی دعوت کرنا ہوتی ہے تو اُسے نہ تو وہ اپنے دفتر میں مدعو کرتا ہے نہ گھر پر بلکہ اس کام کے لئے وہ کوئی ہوٹل کرایہ پر لے لیتا ہے۔ اس کی دوستی کسی دولتمند آدمی سے نہیں ہے بلکہ اٹلی کے عیاش طبقۂ امرا سے اُسے نفرت ہے۔ تھیٹر کا کسی وقت وہ بہت شوقین تھا مگر وقت نہ ہونے کی وجہ سے اُس نے تھیٹر جانا بھی ترک کر دیا ہے البتہ بعض وقت گھر پر سینما کے پرائیویٹ شو، دیکھ لیتا ہے

مسولینی عموماً ۵ - ۶ گھنٹہ محنت سے کام کرتا ہے۔ البتہ جب کوئی نازک صورت پیدا ہو جاتی ہے تو اس وقت میں توسیع ہو جاتی ہے ورنہ باقی ماندہ وہ مطالعہ اور ورزش وغیرہ میں گزارتا ہے۔ وہ نہایت صفائی پسند اور پابند اوقات ہے اور جب تک اس کا دفتری کام نہ ختم ہو جائے وہ دفتر نہیں چھوڑتا

اگرچہ دوسرے ڈکٹیٹروں کے برعکس مسولینی کو ایک بڑے خاندان کا کفیل ہونے کی حیثیت سے روپیہ کی زیادہ ضرورت ہے مگر اُسے روپیہ کی پرواہ نہیں ہے۔ اس کی سرکاری تنخواہ تقریباً ۳۵ پونڈ ماہوار ہے اپنی خود نوشت سوانح عمری سے اُسے امریکہ میں ۵ ہزار پونڈ ملے تھے جس کا کچھ حصہ اُس نے روم کے غربا میں تقسیم کر دیا۔ عرصہ تک اس کا ذریعہ آمدنی غالباً ہیرسٹ پریس (Hearst Press) رہا مگر ۳۵-۱۹۳۶ء میں اس نے مستقل مضامین اس وجہ سے لکھنا ترک کر دئے کہ بین الاقوامی سیاسیات اس قدر پیچیدہ ہو گئی تھی کہ وہ صفائی سے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ غالباً مسولینی ہی ایسا ڈکٹیٹر ہے

جو مذہب کا مخالف نہیں ہے۔ یورپ کے تمام ڈکٹیٹروں میں مسولینی تک سب سے زیادہ آسانی کے ساتھ رسائی ہو سکتی ہے اور وہ کافی آدمیوں سے روز ملاقات کرتا رہتا ہے، ایک مرتبہ خود مسولینی نے یہ کہا تھا کہ میں نے ۶۰ ہزار آدمیوں کو ملنے کا موقع دیا ہے اور ۱۸۸۷۱۱۲ آدمیوں کے ذاتی معاملات میں دلچسپی لے چکا ہوں

مسولینی لوگوں کی باتیں ضرور سنتا ہے مگر وہ کسی سے مشورہ بہت کم لیتا ہے۔ اور جب اُس کا جی چاہتا ہے تو اتنا خلوت پسند بن جاتا ہے جیسے تبت کا لاما۔ مسولینی کو ہزاروں ملاقاتی رکھنے کے باوجود کوئی دوست نہ رکھنے پر فخر ہے۔

مسولینی نہایت عمدہ اخبار نویس ہے اور اخبار نویس اُسے سب سے زیادہ پسند بھی ہیں۔ بعض وقت وہ اپنا انٹرویو کرنے والوں سے جواب سے زیادہ خود سوال کر لیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ انٹرویو بہترین پروپیگنڈا ہوتا ہے چنانچہ وہ انٹرویو منظور کرنے میں بہت فیاض ہے دوسری طرف کوئی اوسط درجہ کا اخبار نویس اپنے لئے یہ قابل فخر چیز سمجھتا ہے کہ اتنی بڑی ہستی سے اُسے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے لہذا وہ عموماً اس کے موافق ہی اپنا بیان شایع کرتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک برطانوی اخبار نویس نے مسولینی سے انٹرویو کیا۔ مسولینی نے کسی بات کا ہنس کر جواب دیا تو اخبار نویس نے اس ہنسی کا بھی انٹرویو کی رپورٹ میں تذکرہ کر دیا لیکن جب مسولینی نے تیار شدہ رپورٹ کا مسودہ دیکھا تو اس ہنسی کے تذکرہ کو کاٹ دیا۔ ڈکٹیٹر کبھی نہیں ہنستے!

مسولینی اکثر ادوات مطالعہ کرتا رہتا ہے اور شاید مارکس کو مستثنیٰ کر کے اُسے موجودہ ادبیات پر دور حاضرہ کے دوسرے مدبروں سے کہیں زیادہ عبور ہے۔ اُس نے اپنے مطالعہ کی ایک نوٹ بک بھی بنائی ہے اُس کی تاریخی معلومات بہت صحیح و وسیع ہیں۔ اس کی انشا پردازی میں بھی کسی کو شک نہیں ہو سکتا اپنے اُصول بیان کرنے میں ہٹلر کو چھ سو صفحات کی ایک کتاب لکھنی پڑی مگر مسولینی نے وہی کام فسطائیت پر تقریباً ایک درجن صفحات کا پمفلٹ لکھ کر پورا کر دیا خلاصہ مختصر یہ کہ مسولینی، موجودہ فرمانرواؤں میں تعلیمی حیثیت سے سب سے زیادہ قابل ہے۔ وہ فرانسیسی، جرمنی اور انگریزی سے بھی اچھی طرح واقف ہے

مسولینی کو سب سے زیادہ نفرت، ہٹلر (مگر اب نہیں) طبقۂ امرا، روپیہ، بلی اور بڑھاپے سے ہے۔ خاص کر بڈھی عورتوں سے اُسے بہت چڑ ہے۔ وہ اپنے متعلق یہ تذکرہ بھی شایع ہونے دینا نہیں پسند کرتا کہ وہ کسی بچہ کا نانا ہو چکا ہے جب اُس کی عمر ۵۰ برس کی ہوئی تو اُس نے اطالوی پریس کو حکم دیدیا کہ اس کا ذکر اخبار میں نہ کریں اُسے سب سے زیادہ روم، اپنی لڑکی اڈا، گانوں، کتابوں، ہوائی جہازوں اور تیز رفتاری سے محبت ہے۔ وہ اکثر ہوائی جہاز کے حادثوں سے دوچار ہو چکا ہے

مسولینی کی کامیابی کے راز

مسولینی کی اس زندگی سے اُس کی کامیابی کے راز بھی معلوم ہو سکتے ہیں:۔
باتیں بگھارنے کے باوجود، اُس کا ذہن تجزیہ کن، اور نتیجہ خیز ہے اس کی خود پرستی کو

اٹلی والے بہت اچھی نگاہوں سے دیکھتے ہیں وہ ایک عملی انسان ہے

اس کی سیاسی اور ذاتی دوربینی بہت تیز ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ میں اپنے آپ کو بدل نہیں سکتا۔ میں درندوں کی طرح ہوں۔ میں موسم بدلنے کے قبل ہی اُسے سونگھ لیتا ہوں اور اگر میں اپنے محرکات کا تابع ہو جاتا ہوں تو میں کبھی غلطی نہیں کرتا

وہ قلم کا بڑا دھنی ہے۔ اس نے صرف اپنے قلم کے زور سے طاقت حاصل کی۔ ہر ڈکٹیٹر کی طرح وہ بھی لڑنے کے بعد صلح نہیں کرتا۔ کسی ہٹلر، کسی اسٹیلن اور کسی مسولینی نے کسی دشمن کو کبھی معاف نہیں کیا ہے۔ وہ نمائشی انسان نہیں ہے نہ اُسنے کبھی اپنے عزائم کو چھپایا ہے۔ بلکہ یہ صاف صاف کہدیا ہے کہ میرا عزم، طاقت حاصل کرنا اور حتی الامکان حاصل کئے رہنا ہے اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ میں یہ سب ذاتی غرض کے لئے نہیں بلکہ اپنے ملک کے لئے چاہتا ہوں۔

اُسے ایکٹنگ کرنا خوب آتا ہے اور شاید ٹراٹسکی کے علاوہ اور کوئی مدبر اس کا اس فن میں مقابلہ نہیں کر سکتا۔

مسولینی ایک جسمانی کشش بھی رکھتا ہے۔ اس کے ہر کام میں مستعدی اور پھرتی ہے اور جب وہ فوج کا معائنہ کرنے آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا فوج کے ہر سپاہی کے بدن میں بجلی دوڑ گئی ہے

وہ حساس بھی بہت ہے۔ اگست ۳۵ء میں ایک اخبار نویس جسے مسولینی کافی عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، مسولینی سے انٹرویو کرنے اٹلی آیا انٹرویو کا وقت بھی مقرر ہو گیا مگر اتفاق سے وہ ایک مضمون پہلے لکھ چکا تھا جس میں اُس نے یہ بتایا تھا کہ حبش کی مہم دنیا میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھی جا رہی ہے۔ انٹرویو سے کچھ دیر پہلے مسولینی نے اس مضمون کو دیکھ لیا اور انٹرویو کو منسوخ کر دیا۔ اسی طرح اس نے ایک اخبار 'فارچون' (Fortune) کے اٹلی نمبر کا داخلہ اٹلی میں اس لئے روک دیا کہ اُس نے مسولینی کی ابتدائی زندگی کا کہا ہوا یہ فقرہ اپنے اخبار میں کہیں لکھ دیا تھا کہ "جب میں بیدار ہوتا ہوں تو سب سے پہلے کیا کرتا ہوں؟ بستر سے فوراً اُٹھ پڑتا ہوں — خواہ تکیہ پر میرے قریب کتنا ہی حسین سر نہ رکھا ہوا ہو!"

وہ توہم پرست بھی ہے۔ ایک مرتبہ اس نے ایک ممی کا تحفہ قبول کر لیا تھا مگر جب مصر کے آثار قدیمہ کے مشہور ماہر لارڈ کارنرون کا انتقال ہوا تو مسولینی کو ایسی وحشت ہوئی کہ اُس نے ممی کو فوراً اپنے دفتر سے باہر کرا دیا

وہ شکی مزاج بھی ہے۔ چنانچہ جب اٹلی کے بادشاہ نے روم سے اُس کو ملن ٹیلیفون کیا اور وزارت عظمیٰ کا عہدہ دینا چاہا تو اُس نے کہا کہ سرکاری تار آنے تک میں اس حکم پر عمل نہیں کر سکتا۔ اس کا دماغ اور بخیل نہیں ہے۔ اس کی فسطائیت مارکس (Marx) اور سورل (Sorel) کے خیالات کا بگڑا ہوا خاکہ ہے۔ مسولینی نے نہ فسطی سلام ایجاد کیا اور نہ سیاہ یونیفارم۔ مسولینی بہت صاف گو بھی ہے اور وہ اپنے جذبات کا اظہار اکثر بہت کھلے لفظوں میں کر دیتا ہے۔

تشدد

مسولینی کا پہلا مطبوعہ مضمون جو ۲۱ برس کی عمر میں اُس نے شائع کیا تھا 'تشدد' پر تھا۔ اُس زمانہ میں وہ تعلیمات (Nietzsche) کے زیر اثر تھا مگر 'تشدد' اُس کو ہمیشہ اچھا معلوم ہوا ہے۔

لیکن، وہ کہتا ہے، تشدد کی حیثیت جراحی کی ہونا چاہئے نہ کہ کھیل کی۔ انفرادی ہستیوں کو دوسرے سے خلط ملط کرنے سے اُسی طرح روک دینا چاہئے جیسے ایک ڈاکٹر متعدی مرض کے انسان کو دوسروں کے پاس سے دور کر دیتا ہے۔

مسولینی نے لکھا ہے کہ "کیا کبھی تاریخ میں کوئی حکومت ایسی ہوئی ہے جس نے کبھی تشدد کا استعمال نہ کیا ہو۔ جب کبھی ملک کی یکجہتی ختم ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے تو تشدد ہی کے ذریعہ سے اُسے روکا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی حکومت تشدد پر عمل کرنا بالکل چھوڑ دے، تو وہ حکومت اُس جماعت سے دب جائے گی جو اس وقت سب سے زیادہ منظم ہے

مسولینی کے قتل کرنے کی سازشیں بارہا ہو چکی ہیں چنانچہ وہ پولیس کے افسر اعلیٰ کے مشورہ کے بغیر کسی سڑک پر نہیں چلتا مگر یہ عجیب بات ہے کہ جب وہ گھر سے اپنے دفتر آتا ہے تو اُس کے ساتھ کوئی خاص گارڈ نہیں ہوتا

کہا جاتا ہے کہ ہٹلر کی میز کے خانہ میں ایک پستول رکھا ہوتا ہے تاکہ اگر اُس کی حکومت کو یکایک شکست ہو جائے تو وہ بُرا دن دیکھنے سے قبل فوراً ہی گولی مار کر اپنا خاتمہ کر لے

زندگی بھر اس کی صحافتی اور مصورانہ قوتوں میں جنگ ہوتی رہی ہے ہر اخبار نویس کی طرح وہ ڈراما نویس اور ناول نویس بننا چاہتا تھا۔ چنانچہ قیصر روم اور نپولین کے بعد وہ سب سے زیادہ احترام شیکسپیر، بالذک، ٹیراک، لیسکل کا کرتا ہے۔ شاعر کی حیثیت سے وہ ناکام رہا تو اُس نے آرٹ کی زندگی اختیار کی وہ ڈکٹیٹر اس وجہ سے اور بھی ہو گیا کہ اس میں تخلیقی آرٹ نہیں پایا جاتا تھا

اُس کے نزدیک جولیس سیزر، دنیا کا سب سے بڑا انسان تھا، نپولین سے بھی اُسے بہت محبت ہے اور وہ اُسے اطالوی ہی سمجھتا ہے۔ مسولینی نے روم میں ایسے کتبے تیار کرائے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیصر روم کے زمانہ میں انگلستان، سلطنت روم کی ایک چوکی کی حیثیت رکھتا تھا اور اب وہی برطانیہ، 'بحر روم' کو برطانوی سمندر بنانا چاہتا ہے!

فسطائیت کیا ہے

جب مسولینی برسر اقتدار آیا تو اس کے پاس کوئی پروگرام نہ تھا۔ مگر اُس نے فوراً ایک پروگرام تیار کر لیا جس کا مقصد یہ تھا کہ بجائے طبقہ وارانہ جنگ کے طبقہ وارانہ اتحاد ہو سکے۔ یہ تھی عملی حیثیت سے فسطائیت کی ابتدا۔ یہاں ہٹلر اور مسولینی کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہٹلر کے پاس طاقت حاصل کرنے سے قبل ایک معین پروگرام تھا مگر وہ جلد ہی اُسے بھول گیا مسولینی کے پاس طاقت پانے سے قبل کوئی پروگرام نہ تھا مگر اُس نے فوراً ہی ایک تیار کر لیا

فسطائیت کے موٹے موٹے اُصول ہر شخص کو معلوم ہیں۔ ذاتی جائدادیں اور ذاتی املاک محفوظ ضرور رہیں گے مگر حکومت کی سخت نگرانی میں! ملک کی پیدا کرنے والی طاقت (یعنی مالکان و مزدور) ۲۲ کارپوریشنوں پر مشتمل کر دی گئی ہے جس میں سے ملک کے ایوان ادنیٰ کے ممبران منتخب کئے جاتے ہیں۔ نمایندگی، جغرافیائی رقبہ کے لحاظ سے نہیں

بلکہ پیشہ کے اعتبار سے ہوتی ہے

ہر کارپوریشن میں فسطائی جماعت کے تین نگراں ڈیلیگیٹ ہوتے ہیں۔ ہر کارپوریشن کا افسر کابینہ کا ایک وزیر یا مسولینی کا مقرر کردہ ایک انڈر سکریٹری ہوتا ہے۔ یہ ممبران اس فہرست میں سے بھیجے جاتے ہیں جسے مجلس فسطائیت (Grand Fascist Council) منظور کرتی ہے

فسطائیت کے اندر، مزدوروں کو فایدے بھی ہیں اور نقصانات بھی مثلاً فایدے یہ ہیں:۔

کوئی کارخانہ دار، مزدور کو حکومت کی مرضی کے بغیر برخاست نہیں کرسکتا اور نہ اپنے کارخانہ کی توسیع کرسکتا ہے

اُجرت کی شرح بھی حکومت ہی طے کرتی ہے

نقصانات یہ ہیں:۔

آزادی ختم ہوجاتی ہے۔ مزدوروں کی انجمنیں توڑ دی گئی ہیں اور وہ سرمایہ داروں کے مقابلہ میں کمزور ہوگئے ہیں سرکاری قوانین کے ذریعہ سے ان کی تنخواہیں بے انتہا کم کی جاسکتی ہیں (اور کی گئی ہیں)

ان کو اسٹرائک کرنے کا حق نہیں رہگیا ہے۔

آپ کے فایدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علٰحدہ علٰحدہ خریدفرمائیں گے تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ بریں

نگارستان	جمالستان	ترغیبات جنسی	شہاب کی سرگزشت	استفسار و جواب ہر سہ جلد
دو روپیہ	چار روپیہ	تین روپیہ	ایک روپیہ	نو روپیہ

معرکۂ سخن	مکتوبات نیاز	اُردو شاعری	ہندی شاعری	میزان کل
ڈھائی روپیہ	ڈھائی روپیہ	دو روپیہ	ڈیڑھ روپیہ	ستائیس روپیہ آٹھ آنے

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپیہ میں مل جائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کرینگے

منیجر نگار لکھنؤ

مبادیات تنقید

(مجنوں گورکھپوری کی تقریر جو ۱۲ مارچ کو دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی گئی)

(۲)

گزشتہ تقریر میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ ادب آئینہ ہے زندگی کا۔ اب یہ سوال ہوتا ہے کہ ادب کی صحیح تعریف کیا ہے، زندگی اور ادب میں جو تعلق ہے وہ کس قسم کا ہے؟ اور ادب اور زندگی میں امتیاز کیا ہے؟ کیا ادب کے معنی صرف زندگی کی تکرار یا نقل کے ہیں؟۔ اگر زندگی کے محض اعادہ یا مثنیٰ کو ادب کہتے ہیں تو پھر اصل اور اس مثنیٰ میں کیا فرق ہے اور اسکی ہم کو کیا ضرورت ہے

ادب یا حسن کاری اگر زندگی کی محض ایک سادہ نقل ہے تو یقیناً ایک فعل عبث ہے جو زیادہ سے زیادہ تفریح کا ذریعہ بن سکتا ہے اور افلاطون نے اگر اس کو اپنی جمہوریت سے خارج کر دیا تو بہت ٹھیک کیا۔ لیکن دوسروں کے فیصلہ سے مرعوب ہو کر بہک جانا خطرہ سے خالی نہیں۔ جمالیات (AESTHETICS) کے جتنے نظرئے مختلف زمانوں میں مرتب کئے گئے ہیں ان پر ہم کو غور کرنا چاہیئے اور تحقیق و تنقید کے بعد خود اپنی رائے قایم کرنا چاہیئے

تنقید کا ایک معصومانہ دور وہ بھی تھا جبکہ بلا شرح و تفصیل اور بغیر فکر و استدلال کے ایک چیز کے موافق یا اس کے مخالف ایک حکم لگا دیا جاتا تھا اور لوگ اسکو مان لیتے تھے۔ مثلاً شاعری کو پیمبری کا ایک جزو بتا دیا گیا اور شاعر تلمیذ رحمٰن مان لیا گیا یا اسی شاعر کو شیطان کا شاگرد سمجھ لیا گیا۔ لیکن اب اس قسم کی الہامی تعریف سے کام نہیں چلتا۔ سب سے بڑی مشکل تو یہ ہے کہ فنون لطیفہ اور بالخصوص ادبیات تمام تشریح و تجزیہ کے بعد بھی اپنا پورا راز ہم پر روشن نہیں ہونے دیتے اور الہامی دنیا کی چیز بنے رہتے ہیں۔ اٹھارویں صدی یورپ میں تنقید ادب کا دور رہا ہے اور اس صدی میں شعر و ادب کی طرح طرح سے تعریفیں کی گئی ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ شعر و ادب کو علم و حکمت کے برابر لا کر کھڑا کر دیا جائے۔ لیکن اس کے لئے جس پختہ تلے اور منضبط استدلال کی ضرورت تھی وہ کہیں نظر نہیں آتا۔ سب مجذوبوں کی سی باتیں کرتے ہیں، اور ڈسورتی شاعر کو معلم سمجھتا تھا اور خود ایک معلم ہونا پسند کرتا تھا آخر میں اس سے زیادہ نہ کہہ سکا کہ "شاعری سارے علم کی جان ہے اور اسکا لیا ہوا تیر

جوہر ہے۔" کولرج کی ساری تنقید کا لب لباب یہ ہے کہ "شاعر کا کام ہمارے شکوک کو تھوڑی دیر کے لئے معطل کر دینا اور وقتی طور پر ہمارے اندر یقین کرنے کی صلاحیت پیدا کر دینا ہے"۔ شیلی بڑے جوش و خروش کے ساتھ شاعری کی حمایت کرنے اُٹھا تھا لیکن سب کچھ کہہ چکنے کے بعد بھی اس سے آگے نہ بڑھ سکا کہ "شاعری ایک قسم کی ربانی چیز ہے" اور "تمام علوم کا مرکز و محیط شاعری ہے" اس قسم کی مبہم تعریفوں کو اگر آج مجذوبوں کی بڑ یا صوفیوں کے ہوحق کی طرح عبث اور بے سود کہا جا رہا ہے تو کچھ زیادہ غلط نہیں ہے

سب سے پہلے جس نے ادب کی معقول تعریف کی اور ادب اور زندگی میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی وہ میتھو آرنلڈ تھا۔ ادب کی جو اس نے تعریف کی ہے وہ آج تک ضرب المثل ہے۔ اس نے ادب کو زندگی کی تنقید بتایا ہے۔ یہ تعریف اگرچہ مبہم ہے لیکن ہے بہت گہری اور اس جدید میلان کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس نے اسی زمانہ میں کرل مارکس سے اشتراکی اعلان (Communist Manifesto) لکھوایا

اسی زمانہ میں "حسن کاری برائے حسن کاری" یا "ادب برائے ادب" کا خالص جمالیاتی نظریہ بھی وجود میں آیا جس کی ابتدا کیٹس سے ہوتی ہے۔ کیٹس کو ایسی شاعری سے نفرت تھی جو کوئی محسوس غایت یا کوئی خاص مقصد پیش نظر رکھتی ہو اس کے لئے حسین چیز بجائے خود ایک ابدی مسرت تھی۔ وہ کہتا ہے "حُسن حقیقت ہے اور حقیقت حسن بس اتنی ہی سی بات ہے اور ہم کو اسی قدر جاننے کی ضرورت ہے"۔ اس کے بعد یورپ کے بڑے بڑے نقادوں نے اس خیال کی حمایت اور اشاعت کی سب نے ایک آواز ہو کر یہی کہا کہ حسن مقصود بالذات ہے اور نیکی اور بدی کے حدود سے بالکل باہر ہے۔ شعر و ادب کا کام ہمارے اندر حسن کا احساس پیدا کرنا اور اس کو قایم رکھنا ہے۔ یہ احساس حسن ہماری ابدی مسرت کی ضمانت ہے۔ زندگی میں جتنی کریہہ اور بدصورت چیزیں ہیں ان کو بھی حسین بنا دینے کا نام "حسن کاری" ہے۔ والیٹر پیٹر اسی جماعت سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا اصرار ہے کہ ادب کی غایت سوا لذت و انبساط کے اور کچھ نہیں۔ آجکل اٹلی کا مشہور فلسفی ماہر جمالیات کروچے اسی ماورائی نظریہ کا علم بردار ہے اس کے خیال میں حسن کاری یعنی آرٹ ایک وجدانی تجربہ ہے جو آپ اپنی غایت ہے اور جس کو منطق و فلسفہ یا مذہب و اخلاق کے اُصول سے نہیں جانچا جا سکتا۔ یہ جمالیاتی ماورائیت (Aesthetic Transcendentalism) زندگی پر ایک غیر ارضی سطح سے نظر ڈالتی ہے اور ہر چیز کو حسین و جمیل بنا کر پیش کرتی ہے جو چیز زندگی میں کریہہ اور بُری ہے وہ جمالیات میں حسین اور اچھی ہو جاتی ہے

یہ خالص تخئیلیت (Idealism) انسانی معاشرت کے لئے خطرات سے خالی نہیں۔ بدی کو نیکی۔ جھوٹ کو سچ۔ بدصورتی کو حسن۔ غم کو راحت بنانے کی عادت جب ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو بیماری ہو جاتی ہے اور انسان اس کے ہاتھوں کاہلی تعیش اور مجہولیت کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ تخئیلیت نے اگر دنیائے واقعات سے منہ پھیر لیا تو وہ دنیائے انسانیت کی تہذیب و تحسین میں کوئی حصہ نہ لے سکیگی اور ایک قسم کا فالج یا جنون ہو کر رہ جائے گی۔ دنیا کو

اس فالج یا جنون سے محفوظ رکھنا ہے

تخئیلیت یا روحانیت، انسانی تمدن کو جس خطرہ کی طرف لیجا رہی تھی اس کا احساس بہت جلد ہونے لگا اور دھیرے دھیرے یہ احساس ساری دنیا پر چھا گیا۔ سب سے پہلے مارکس اور انگلز نے ہم کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ حسن کاری اور ادب ہیئت اجتماعی اور نظام تمدن کی خدمت میں آلۂ نشر و تبلیغ ہوتے ہیں اور چونکہ تہذیب و تمدن کا اجارہ ابتک طبقۂ اعلیٰ یا سرمایہ داروں کے ہاتھ میں رہا اس لئے ہمارے ادیب اور شاعر اب تک جس تہذیب کی نمایندگی کر رہے تھے وہ اقلیت کی تہذیب (Minority Culture) تھی۔ اور صرف ایک کم تعداد فراغت نصیب جماعت کی پیدا کی ہوئی چیز تھی جس کو جمہور کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اب چونکہ تمدن کی دنیا میں شدید انقلاب کی ضرورت ہے۔ اور سرمایہ داری کی سر بہ فلک عمارت منہدم ہو رہی ہے اور اس کی جگہ جمہوریت اور مزدور شاہی کی نئی تعمیر لے رہی ہے اس لئے ادب کے رسوم و روایات میں بھی انقلاب کی ضرورت ہے۔ ابتک ادیب سرمایہ دار کی عشرت گاہ کا مزدور تھا اور ایک چیدہ جماعت کے حرکات و سکنات اور اس کے نفسیات و میلانات اس کی کل کائنات تھی۔ مگر اب ادب کو اجتماعی شعور اور جمہوری ذہنیت کا آئینہ ہونا چاہئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ واقعہ کو تخئیل پر ترجیح دیں اور مادی دنیا پر اپنی نظر جمائے رہیں ورنہ ہم جمہور کے ساتھ نہیں رہ سکیں گے

مارکس کے بعد اس کے شاگرد اس نظریہ کو اتنی دور لے گئے کہ اس کا اصل مقصد کچھ سے کچھ ہو گیا۔ آج اشتراکیت ادب سے جو مطالبات کر رہی ہے وہ ادب کو ادب نہیں رہنے دیں گے۔ اب ادب کو بھی جماعت کا ایک آلۂ جنگ سمجھنے کی تحریک ہو رہی ہے۔ ۱۹۳۰ء میں خارکاف کے مقام پر جو اشتراکی کانگریس ہوئی تھی اس میں ایک مقرر نے کہا تھا "قلم یکف ہم لوگ بین الاقوامی مزدوروں کی جماعت کی ناقابل شکست فوج کے سپاہی ہیں"۔ اس کانگریس میں جو باتیں طے پائی تھیں ان کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) حسن کاری جماعت کا ایک ہتھیار ہے (۲) حسن کاروں اور ادیبوں کو انفرادیت ترک کر دینا چاہئے (۳) جمالیات کی اجتماعی تنظیم ہونا چاہئے اور اس کو فوج اور دفاتر کی طرح ایک مرکزی سرکار اور مرکزی قوانین کے ماتحت ہونا چاہئے۔ اور یہ سب کچھ اشتراکی جماعت کی سرکردگی میں انجام پائے گا۔ آپ نے سنا اشتراکیت سپاہیوں کی طرح اپنے ادیبوں اور شاعروں کو بھی سُرخ وردی پہنانا چاہتی ہے اس لئے کہ ان سے بھی قواعد لیجائے گی۔ لیکن یہ ہونا تھا۔ فرعون اور موسےٰ دنیا میں ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ خالص جمالیت (Art for Art's sake) نے جو افراط کی تھی اس کا جواب اسی تفریط سے دیا جا سکتا تھا۔ "ادب برائے ادب" کے نظریہ نے ادب کو محض ایک من کی موج اور امیروں کے لئے ایک تفریح کی چیز بنا کر رکھ دیا تھا۔ لوگ دنیا میں رہ کر دنیا سے بیگانہ ہو رہے تھے۔ ایک مشہور روسی ادیب کا خیال بہت صحیح ہے کہ ادب برائے ادب کا میلان اس بات کی دلیل ہے کہ ادیب اور اس کے ماحول کے درمیان تصادم ہے۔ مادی دنیا سے انسان

بھاگتا اسوقت ہے جبکہ وہ مشکلات کا سامنا کرنے کی تاب اپنے اندر نہیں پاتا۔ خالص جمالیت کے حامیوں نے ایک پرانی مثل سے بہت غلط فایدہ اُٹھایا اور اسکی تاویل میں بڑی زبردستی کی۔ کہا گیا ہے کہ انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہیگا اسمیں سب سے اہم "صرف" ہے اسکے یہ معنی ہرگز نہیں تھے کہ انسان بغیر روٹی کے بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب بھی زندگی کا ایک شعبہ ہے اور زندگی نام ہے ایک جدلیاتی حرکت (Dialectic Process) کا جس کے ہمیشہ دو متضاد پہلو ہوتے ہیں۔

ادب بھی ایک جدلیاتی حرکت ہے اور اس کے بھی دو متضاد رخ ہیں۔ ایک تو خارجی یا عملی یا افادی دوسرا داخلی یا تخیلی یا جمالیاتی حسن کار یا ادیب کا کام یہ ہے کہ وہ ان دو بظاہر متضاد میلانات کے درمیان توازن اور ہم آہنگی قایم کئے رہے ورنہ ان میں سے کہیں ایک کا پلہ بھاری ہوا وہیں فساد و انتشار پیدا ہونے لگیگا۔ مارکس نے جو کچھ کہا تھا اس کا مطلب اسکے سوا کچھ نہ تھا کہ ادیب کو زمانہ کے پیچھے نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں تھے کہ ادیب زمانہ کا غلام ہے۔ ادب حال کا آئینہ ہوتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ مستقبل کا اشاریہ بھی ہوتا ہے اور اس کے لئے بیک وقت واقعیت اور تخئیلیت، افادیت اور جمالیت۔ اجتماعیت اور انفرادیت سب کی ضرورت ہے۔ ماحول ادیب کو پیدا کرتا ہے مگر ادیب ماحول کی از سر نو تعمیر میں مدد کرتا ہے۔ ادب بیک وقت حال کی آواز اور مستقبل کی بشارت ہے

سب سے بڑا ادیب وہ ہے جو حال اور مستقبل کو ایک آہنگ بنا کر پیش کرے۔ دنیا میں جتنے بڑے ادیب اور شاعر گزرے ہیں وہ سب واقعات کی کثیف دنیا میں گردن تک ڈوبے کھڑے ہیں مگر ان کے ہاتھ ستاروں کو پکڑنے کے لئے آسمان کی طرف بڑھے ہوئے ہیں

ادب ایک آلۂ نشر و اشاعت ایک ذریعہ تحریک و تبلیغ ضرور ہے لیکن ہر ایسا آلہ اور ہر ایسا ذریعہ ادب نہیں ہوتا۔ اخباروں سے بڑھکر نشر و اشاعت اور تحریک و تبلیغ کا ذریعہ کیا ہو سکتا ہے۔ مگر اخباروں کو ادب میں شمار کرنے کی جرأت انقلابی تنقید (Revolutionary Criticism) بھی مشکل ہی سے کر سکتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اخبارات میں "روح عصر" کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور ادب میں "روح عصر" کے علاوہ بھی ایک عنصر ہوتا ہے جس کا تعلق "ماورائے عصر" سے ہوتا ہے اور جس کی بدولت وہ ادب ہر زمانہ کی چیز بن جاتا ہے یعنی وہی واقعیت (Realism) اور تخئیلیت (Idealism) کا شیر و شکر ہونا۔ آج کل کے مشہور انگریزی نقاد جے۔ بی پریسٹلی (J. B. Priestley) کا خیال بہت صحیح ہے کہ حسن کاری یعنی آرٹ کو زندہ رکھنے کے لئے تھوڑی سی افیون کی ہمیشہ ضرورت پڑے گی۔

میتھو آرنلڈ نے ادب کو جو زندگی کی تنقید کہا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا۔ ادب جماعت اور افراد کی زندگی کی نہ صرف تصویر ہے بلکہ اس کی تنقید ہے اور مارکس کے نظریہ کا مطلب بھی اس سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ اس کا یہ کہنا بہت صحیح ہے کہ فلسفہ اور ادب دونوں صدیوں تک دنیا کی یا تو جنسِ تصویر پیش کرتے رہے ہیں یا اس کی تاویلیں کرتے رہے ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ دنیا پر تنقیدی نظر ڈالی جائے اور اس کو بدلا جائے اور بہتر سے بہتر بنایا جائے۔ مارکس اصرار

کے ساتھ ہم کو صرف یہ سمجھانا چاہتا تھا کہ زندگی ایک جدلیاتی حقیقت (Dialectic Reality) ہے اور تغیر نمو اور ارتقا اس کی فطرت میں داخل ہیں۔ ادب کو اس کا ثبوت دینا چاہیے۔ اس نے قدیم یونانی فنون لطیفہ اور ادبیات کی مثال دیکر ہم کو سمجھایا ہے کہ ادب صرف اس یونانی معاشرت کا نتیجہ ہو سکتا تھا جو بجائے خود خرافاتی دور (Mythological age) کی چیز تھی اور خرافاتی تصورات (Mythology Ideology) پر مبنی تھی۔ آجکل کا صنعتی دور اور صنعتی تمدن اس ادب کو دہرا نہیں سکتا۔ دوسرے الفاظ میں اس کو یوں سمجھئے کہ اگر ادیب کو واقعی زندہ رہنا ہے اور وہ معاشرت کی تہذیب و ترقی میں کوئی نمایاں حصہ لینا چاہتا ہے تو وہ بھاگ کر ماضی میں پناہ نہیں لے سکتا

لیکن ادب اگر زندگی کی تنقید ہے تو وہ محض حال پر بھی اکتفا نہیں کر سکتا۔ تنقید کا مقصد ہمیشہ نئی تعمیر ہوتا ہے اور نئی تعمیر کے لئے ہمیشہ ایک استقبالی میلان (Prospective attitude) کی ضرورت ہوتی ہے جس کا دوسرا نام تخئیل ہے۔ کامیاب ادب قدما کے نزدیک بھی دو متضاد عنصروں سے مرکب ہے۔ محاکات اور تخئیل۔ محاکات کا تعلق حال سے ہوتا ہے اور تخئیل کا تعلق مستقبل سے۔ واقعہ کے ہمیشہ دو رُخ ہوتے ہیں ایک تو واقعی یا ساکن اور دوسرا امکانی یا متحرک۔ اور ادیب کی بصیرت ان دونوں کو ایک کر دیتی ہے۔ گویا خواب اور حقیقت کے امتزاج کا نام ادب ہے

مارکس کے نظریہ پر تبصرہ کرتے وقت ہم کو ہوشیار رہنا چاہئے۔ وہ اسوقت پیدا ہوا جبکہ جرمنی میں ماورائیت (Transcendentalism) بُری طرح چھا رہی تھی اور حکما کائنات کا مرکز مادی سطح سے اکدم ہٹا کر روحانی سطح پر قائم کرنا چاہتے تھے۔ وہ مادہ سے انکار کر رہے تھے اور صرف ایک جوہر اعلیٰ یا روح کو اصل حقیقت مانتے تھے کائنات اور حیات انسانی کی روح رواں یہی جوہر اعلیٰ ہے جو خدا کا دوسرا نام ہے۔ مارکس کی مادیت اس تعلیم کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ زندگی کی ابتدا تصور سے نہیں وجود سے ہوتی ہے اور اس کی بنیاد مادی قوتوں پر ہے ہئیت اجتماعی میں آکر یہ مادی قوتیں زیادہ تر اقتصادی (Economic) رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ زندگی کے اقتصادی پہلو پر مارکس نے جو زور دیا وہ ایک خالص عصری چیز تھی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ادب اقتصادیات کی غلامانہ پیروی کرتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اقتصادیات کل زندگی نہیں ہے بلکہ اس کا صرف ایک عنصر ہے۔ جو لاکھ اہم سہی کسی دوسرے عنصر پر غالب نہیں ہو سکتا۔ یہ سچ ہے کہ بغیر روٹی کے کوئی زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکتا لیکن پھر وہ صدیوں پرانی مثل بھی آج تک بدستور سچ ہے کہ انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہ سکتا

آخر میں دو سوالات واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ادب میں انفرادیت کی گنجایش ہے یا نہیں؟ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ حسن کار (Artist) کو اپنی شخصیت قربان کر دینا چاہئے دوسروں کی رائے ہے کہ نہیں حسن کار کی اپنی شخصیت اگر اس کے کام میں نہیں جھلکتی تو یہ شدید نقص ہے اگر غور کیا جائے تو در پردہ یہ سوال پہلے ہی حل

کیا جا چکا ہے۔ ادب یا حسن کاری کے دو متضاد پہلو بتائے گئے۔ ایک تو میلاناتی (Tendencious) دوسرا جمالیاتی (Aesthetic) جہاں تک ادب میلاناتی ہے وہاں تک اس کا تعلق اجتماعی ذہنیت اور معاشرتی میلانات سے ہے لیکن اس کا جمالیاتی پہلو یقیناً ادیب کی انفرادیت کا ممنون ہوتا ہے۔ آخر اس کا کیا سبب کہ ایک ہی ملک ایک ہی زبان اور ایک ہی معاشرتی دور کے دو مختلف شاعروں کے کلام اسقدر مختلف ہوتے ہیں

اسی طرح دوسرا سوال بھی ایک ضمنی سوال ہے یعنی یہ کہ ادب میں صورت اور اسلوب زیادہ ضروری ہیں یا موضوع اور مواد؟ موضوع اور مواد معاشرتی میلانات سے ملتے ہیں اور ادب کے خارجی یا اجتماعی عناصر ہوتے ہیں۔ صورت اور اسلوب کو ادیب کی انفرادیت مہیا کرتی ہے اور اب وہ ادب کے جمالیاتی عناصر ہوتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ادیب کی انفرادیت خود معاشرتی حالات اور اجتماعی میلانات کی ساختہ و پرداختہ ہوتی ہے یہ سچ ہے لیکن پھر یہ انفرادیت معاشرت اور ہیئت پر بھی اپنا اثر ڈالتی ہے ورنہ وہ مستقبل کی تعمیر میں کوئی حصہ نہ لے سکتی۔ انفرادی مزاج اور اجتماعی میلانات عمل اور ردعمل کا ایک ایسا باہم مربوط سلسلہ ہے جس کو کہیں سے توڑا نہیں جا سکتا

مختصر یہ کہ کامیاب ترین ادب وہ ہے جو حال کا آئینہ اور مستقبل کا اشاریہ ہو جس میں واقعیت اور تخئیلیت، افادیت اور جمالیت ایک آہنگ ہو کر ظاہر ہوں جس میں اجتماعیت اور انفرادیت دونوں ملکر ایک مزاج بن جائیں۔ جو ہمارے ذوق حسن اور ذوق عمل دونوں کو ایک ساتھ آسودہ کر سکے۔ اب تک ادب جو کچھ بھی رہا ہو لیکن اب اس کو یہی ہونا ہے

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

دہلی مرحوم کی داستان الم

دلّی کا سنبھالا

از خواجہ محمد شفیع دہلوی

مرحوم دہلی کے عروج کے آخری ایام کی مرقع نگاری دہلی کی اس ٹکسالی زبان میں کی گئی ہے جواب نابود ہے
انداز بیان ایسا موثر ہے کہ دل بے اختیار ہو جاتا ہے ——— قیمت عہ

مکتبۂ جامعہ ——— دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور

گُناہ

حیات۔ مظہرِ صد شور و اضطراب گُناہ
شباب ہے کہ ہے اِک دلکشیِ خوابِ گُناہ

گُناہ کیا ہے؟ تخیل پہ پردۂ ظلمت
کہیں حرم تو کہیں دیر ہے کتابِ گُناہ

یہ ہے حقیقتِ انکارِ سجدۂ ابلیس
سمجھئے شرک نہ کرنا بھی از حسابِ گُناہ

اُلٹ دیا رخِ انور سے حسن نے پردہ
ازل سے عشق جنوں زا ہوا فیضیابِ گُناہ

میں کچھ سمجھ ہی کے دنیائے دل لٹا بیٹھا
نہ حرصِ خیر نہ ہے ہیبتِ عذابِ گُناہ

تری بہشت کی ہیئت سے واہ واعظِ زاہد
دماغ و دل میں عجیب و غریب ہے گُناہ

دلِ حزیں! یہ ہیں لفظِ کریم کے معنے
عبث شمارِ گناہ و عبث حسابِ گُناہ

گُریزِ خیر بہ اندازۂ رمِ آہو،
مثالِ گریۂ مسکیں تنِ شباب گُناہ

عدم جمود و تعطل کی زیست کا ضامن
وجود لخلخۂ گردانِ مشکنابِ گُناہ

پکارتا ہے یہ اندازِ دوست لے زاہد!
اُٹھا حجابِ ثواب اور اُلٹ نقابِ گُناہ

ذرا تو بیٹھ کے خلوت میں سوچ لے واعظ!
کہ نازِ زہد ہے اک درسِ پیچ و تابِ گُناہ

میں کیا ہوں؟ بندہ نوازی کا معجزہ مضطر
مری طرح بھی نہ ہوگا کوئی خرابِ گُناہ

منظور حسین خاں مضطر ایم۔ اے شاہجہانپوری

غزل

شرف زیدی رامپوری

جو اشک سرخ سے دامن کو لالہ زار کرے
خزاں کی فصل کو وہ رشک صد بہار کرے

عطائے عام ہے وہ آئے طور کی جانب
جو چشم دل سے تماشائے حسن یار کرے

ہزار وعدے ہوں جھوٹے مگر ہمارا دل
تمہارے وعدے کا ہر بار اعتبار کرے

یہی وہ آنکھ ہے جو سب کے ہوش کھوتی ہے
یہی جو چاہے تو دم بھر میں ہوشیار کرے

ابھی تک اُس کو یہ سمجھو کہ ہوش باقی ہے
جو اپنے جیب و گریباں کو تار تار کرے

یہ جستجو میں اب اُس کی ہوئی ہے مایوسی
وہ سامنے ہو مگر دل نہ اعتبار کرے

سمجھ لے جو کوئی کیفیت فراق و وصال
تو عمر بھر وہ تمنائے ہجر یار کرے

پیام ہے یہ اسیروں کا باغباں کے لئے
کہ ابکی سال ہمارا نہ انتظار کرے

رضائے یار پہ راضی رہے شرف انساں
کبھی نہ شکوۂ آلام روزگار کرے

اب دل کا حال نہ پوچھو کچھ غم سہتا ہوں غم سہنے دو
چھڑ جائیں گے پھر لاکھوں قصے یہ بات یہیں تک رہنے دو

الفت میں تو یہ بھی ہوتا ہے تھپڑ بھی لگیں کپڑے بھی پھٹیں
میں پاگل بھی سودائی بھی کہتی ہے جو دنیا کہنے دو

زلفیں رخ روشن پر چھوٹیں اندھیر نہ ہو پردہ بھی رہے
چھنتے جو رہیں کچھ کچھ جلوے یوں چاند گہے تو گہنے دو

ان قہر کی نظروں سے منہ پر کیوں مہر لگائی جاتی ہے
شکووں کا مزا تو اسمیں ہے کچھ سننے دو کچھ کہنے دو،

دریائے محبت میں ڈوبا جو کوئی یہ سمجھو پار ہوا
ساحل سے نہ کچھ ہاتھ آئیگا منجدھار میں کشتی بہنے دو

اے چارہ گرو گھبرا ہو نہیں جاتا ہی رہیگا درد جگر
رو کو نہ مجھے اب رونے سے کچھ خون کے آنسو بہنے دو

تم نے تو نہیں دیکھا ہے شرف پھر کہہ دو مجنون الفت
ہیں چاک گریبان و دامن زنجیریں پاؤں میں پہنے دو

اس لئے اس نے اس ذریعہ سے لوگوں کو مالوف کرنا چاہا اور ایک بڑی جماعت اپنے ساتھ کرلی ضیاء برنی لکھتا ہے کہ:-

"ہر منزل پر پانچ من زریں تارے (اخترِ زر) ایک سبک سی منجنیق میں رکھ کر اُڑائے جاتے تھے۔ اور ہزاروں آدمی اُن کے لوٹنے کے لئے جمع ہو جاتے تھے"

اسی طرح جب بعض امراء و خوانین دہلی سے علاؤالدین کے روکنے کے لئے روانہ کئے گئے تو علاؤالدین نے اُن سے جنگ کرنا مناسب نہ سمجھا بلکہ صرف دولت سے اُن کا مقابلہ کیا اور اس طرح سلطان جلال الدین (مرحوم) کی تمام فوج کو اپنا طرف دار بنالیا۔ حسب روایت تاریخ علائی ۲۲ ذی الحجہ ۶۹۵ھ کو اور حسب روایت بیان تاریخ وصاف ذی قعدہ ۶۹۵ھ میں علاؤالدین دہلی پہونچا جہاں وہ دوبارہ (صحیح معنی میں) تخت نشین ہوا۔

---

۱ علاؤالدین، سلطان جلال الدین خلجی کے عہد میں کڑہ مانک پور کا حاکم تھا ۱۲۹۴ء یعنی ۶۹۴ھ میں تخت نشین ہونے کے سال ڈیڑھ سال قبل اس نے مالوہ اور بندیلکھنڈ کی شورشوں کو دفع کرکے کوہستان وندھیا کے دشوار گزار دروں کو طے کیا اور صرف ۸۰۰ آدمیوں کی جمعیت سے دیوگر پہونچا جو مرہٹہ راج کا پایۂ تخت تھا اور اس کو فتح کرکے دکن کی طرف بڑھکر ایلچ پور پر قبضہ کیا یہ مسلمانوں کا پہلا قدم تھا جو دکن کی طرف بڑھا ان فتوحات سے علاءالدین نے بے شمار دولت حاصل کرلی تھی جسے وہ اب اپنے قیام سلطنت کے لئے بیدریغ صرف کر رہا تھا

۲ جب سلطان جلال الدین کے قتل کی خبر پہونچی تو اس کی بیوی ملکۂ جہاں نے اپنے چھوٹے بیٹے قدر خاں ابراہیم کو رکن الدین کا خطاب دیکر تخت نشین کردیا اور بڑے بیٹے ارکلی خاں کی آمد کا انتظار نہیں کیا جو اُسوقت ملتان میں تھا اس سے ارکلی خاں برہم ہوگیا اور دہلی نہیں آیا یہی ناعاقبت اندیشی تھی جس نے علاءالدین کو تخت دہلی کی طرف مایل کیا۔ ورنہ وہ صرف سلطنت لکھنوتی کا ارادہ رکھتا تھا۔ رکن الدین کی سلطنت اسوقت تک رہی جب تک علاءالدین دہلی نہیں آیا تاہم لین پول کی تحقیق سے ثابت ہے کہ اس نے اتنا زمانہ ضرور پایا کہ وہ اپنے نام کے سکے جاری کرسکا

۳ تاریخ فیروز شاہی (الیٹ) ۳-۱۵۹

۴ تاریخ علائی جسے خزائن الفتوح بھی کہتے ہیں حضرت امیر خسرو کی تصنیف ہے جس میں عہد سلطان علاءالدین خلجی کے (جسے امیر خسرو نے محمد شاہ سلطان بھی لکھا ہے) ابتدائی دور میانی حالات (۶۹۵ھ سے لیکر ۷۱۰ھ تک کے درج ہیں۔

امیر خسرو کا نام فرشتہ نے ابوالحسن لکھا ہے اور الیٹ نے (جلد سوم صفحہ ۵۲۳ میں) یمین الدین محمد حسن تحقیق کیا ہے۔ ان کے باپ کا نام سیف الدین محمود تھا۔ ایک ترکی قبیلہ لاچین کے مشہور فرد تھے۔ دولت شاہ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ وہ امراء بلخ میں سے تھے اور فتنۂ چنگیز خانی سے بھاگ کر ہندوستان میں آئے۔ امیر خسرو بمقام مومن آباد جسے اب پٹیالی کہتے ہیں، ۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ مولوی شبلی نے بیان خسرو میں تاریخ ولادت ۶۰۵ھ لکھی ہے جو کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتی کیونکہ ۶۰۵ھ میں خاندانِ غلام کا سب سے پہلا بادشاہ قطب الدین ایبک فرمانروا تھا اور یہ خود مولوی شبلی نے لکھا ہے کہ:- "جب امیر خسرو سن رشد کو پہونچے تو دہلی کے تخت پر سلطان غیاث الدین بلبن صدر نشین تھا۔ اور اسکا زمانۂ حکومت ۶۶۴ھ سے شروع ہوا ہے"

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۶ پر ملاحظہ ہو)

تخت نشین ہوتے ہی اس نے ایک طرف خاندان و امرار جلالی میں سے ان لوگوں کو جن کی طرف سے ادعائے سلطنت یا تحریک بغاوت کا شبہ ہو سکتا تھا تہ تیغ کرنا شروع کیا اور دوسری طرف اپنے خزانہ کا دروازہ کھول دیا تاکہ جو برہمی اس کی طرف سے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۵)

یقیناً کاتب کی غلطی سے یہ تاریخ بیان خسرو میں نادرست درج ہوگئی۔ پھر قران السعدین میں امیر خسرو نے خود تحریر فرمایا ہے کہ ۶۸۸ھ میں ان کی عمر ۳۶ سال کی تھی۔ امیر صاحب کو سب سے پہلے ملک چھجو (برادر زادۂ بلبن) کے دربار میں رسائی ہوئی اور دو برس تک اس کے پاس ملازم رہے اس کے بعد بغراخاں (بلبن کے بیٹے) حاکم سامانہ کے ندیم ہو گئے۔ جب بلبن نے طغرل حاکم لکھنوتی (بنگال) کی بغاوت فرو کرکے وہاں کی حکومت بغراخاں کو سپرد کی تو امیر صاحب بھی ساتھ گئے لیکن وہاں جی نہ لگا اور دہلی واپس آئے یہاں سلطان بلبن کا بڑا بیٹا سلطان محمد (مشہور بخان شہید) کاملین فن کا بڑا قدر شناس تھا اس نے امیر صاحب کو بلا کر اپنے دربار سے متعلق کر لیا اور جب ملتان کی حکومت اس کے سپرد ہوئی تو انھیں بھی ساتھ لے گیا۔

جب تیمور خاں (جو ارغو خاں فرمانروائے ایران نبیرۂ ہلاکو خاں کا سردار تھا) لاہور اور دیپال پور کو فتح کرکے ملتان پہونچا اور سلطان محمد شہید ہوا تو امیر خسرو تاتاریوں کے قیدی ہو گئے۔ لیکن دو برس بعد کسی طرح انھوں نے رہائی پائی اور وہاں سے بھاگ کر دلی آئے اور چند دن قیام کرکے پٹیالی پہونچ گئے۔ جب ۶۸۶ھ میں بلبن نے وفات پائی اور اس کا پوتا کیقباد تخت نشین ہوا تو اس نے امیر صاحب کو اپنے دربار میں طلب کیا لیکن چونکہ ملک نظام الدین وزیر امیر صاحب سے کچھ خلش رکھتا تھا۔ اس لئے انھوں نے تعلق پسند نہ کیا۔ اور خان جہاں کی ملازمت اختیار کر لی جو امرار شاہی میں سے تھا۔ جب خان جہان اودھ کا صوبہ دار مقرر ہوا تو امیر صاحب بھی ساتھ چلے گئے لیکن دو برس کے بعد والدہ کی محبت اور طلب سے مجبور ہو کر پھر دلی آئے اس زمانہ میں جلال الدین خلجی طبقۂ امرار میں خاص امتیاز رکھتا تھا، اس نے امیر صاحب کی بہت قدر کی جس کا ذکر ہم اصل کتاب میں کر چکے ہیں۔

جب کیقباد، (غلام خاندان کے آخری بادشاہ) کے بعد یہی جلال الدین خاندان خلجی کا سب سے پہلا بادشاہ ہوا تو اس نے دل کھول کر امیر صاحب کے کمالات کی قدر کی۔ جلال الدین کے بعد سلطان علاء الدین کا زمانہ آیا تو اس نے بھی امیر صاحب کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا اور ایک ہزار تنکہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ علاء الدین کے بعد قطب الدین مبارک بادشاہ ہوا اور اس نے امیر صاحب کی قدر دانی بہت زیادہ کی چنانچہ جب ۷۱۸ھ میں امیر خسرو نے اس کے نام پر مثنوی نہ سپہر لکھی تو اس نے ہاتھی کے برابر روپیہ تول کر امیر صاحب کو انعام دیا۔

اس کے بعد جب خلجی خاندان سے حکومت منتقل ہوئی اور تغلق خاندان کا اولین فرمانروا سلطان غیاث الدین صدر نشین ہوا تو اس نے بھی امیر صاحب کی قدر شناسی میں کوئی کمی نہیں کی اور اپنے دربار میں جگہ دیکر اپنا ندیم خاص بنایا۔ جب امیر صاحب نے تغلق کے ساتھ بنگال کا سفر کیا تو وہیں آپ کو معلوم ہوا کہ آپ کے پیر و مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے انتقال کیا۔ آپ فوراً دلی واپس آئے اور تمام دولت خواجہ صاحب کے نام پر نثار کرکے وہیں گوشہ نشین ہو گئے اور ۶ ماہ بعد ذی قعدہ ۷۲۵ھ میں انتقال کیا۔ آپ کا مزار حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے پائیں میں موجود ہے اور اب بھی زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۷ پر ملاحظہ ہو)

لوگوں کو پیدا ہوگئی تھی دور ہو جائے اور چچا کے قتل کرنے کا داغ بھی محو ہو سکے چنانچہ وہ اس میں بہت کامیاب ہوا اور اس کی

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۷)

امیر صاحب کی ذات صرف ہندوستان کی بلکہ تمام اسلام کے لئے مایۂ ناز ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس درجہ کے جامع کمالات نفوس دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ علاوہ شاعری کے موسیقی کے بھی آپ بہت بڑے ماہر تھے اور اس فن کے کاملین میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ عربی و ترکی و ہندی زبانوں میں بھی آپ نے کثرت سے اشعار لکھے۔ صرف فارسی زبان کے اشعار کا شمار تین اور چار لاکھ کے درمیان کیا جاتا ہے سنسکرت میں بھی آپ کو کامل وقوف حاصل تھا پھر اسی کے ساتھ جب آپ کے کمالات باطنی پر نظر کی جاتی ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ شخص جو امراء دربار اور بادشاہوں کی صحبتوں میں زندگی بسر کرتا تھا وہ روحانیت میں کیونکر اتنی ترقی کر سکا کہ خود ان کے پیر نے دعا کی کہ "الٰہی بہ سوز سینۂ ایں ترک مرا بخش"۔

نفحات الانس میں مولانا جامی نے لکھا ہے کہ امیر صاحب نے ۹۲ کتابیں تصنیف کیں جن میں اب صرف چند نظر آتی ہیں:۔

۱۔ دیوان تحفۃ الصغر — اس میں ۱۶ سال کی عمر سے ۱۹ برس تک کا کلام درج ہے

۲۔ دیوان وسط الحیات — ۲۰ سال کی عمر سے ۳۴ سال تک کا کلام پایا جاتا ہے اس میں وہ قصاید بھی ہیں جو سلطان شہید اور ملک چھجو وغیرہ کی مدح میں آپ نے لکھے تھے

۳۔ دیوان غرۃ الکمال — اس میں ۳۴ سال کی عمر سے لیکر ۴۴ سال تک کا کلام درج ہے۔ دیباچہ میں اپنی مختصر سوانح حیات بھی لکھی ہے اور کیقباد اور جلال الدین خلجی کے مدحیہ قصاید بھی اس میں پائے جاتے ہیں۔ صرف دو ہفتہ میں اسکو مرتب کر کے دیباچہ لکھا

۴۔ بقیہ نقیہ — ضعیفی کا کلام ہے اس میں سلطان علاء الدین خلجی کا مرثیہ درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسمیں کم از کم ۷۱۵ھ کے بعد تک کا کلام درج ہے

۵۔ نہایۃ الکمال — پانچواں اور آخری دیوان ہے جس میں قطب الدین مبارک کا مرثیہ اور اس کے ولی عہد کی مدح بھی پائی جاتی ہے

۶۔ قران السعدین (مثنوی) — امیر صاحب کی سب سے پہلی مثنوی ہے جو انھوں نے اپنی ۳۶ سال کی عمر میں کیقباد اور بغرا خاں (باپ بیٹے) کی مصالحت پر لکھی ہے

۷۔ مطلع الانوار (مثنوی) — مخزن الاسرار کا جواب ہے اور سلطان علاء الدین کے نام سے منسوب ہے ۱۲۳۱ اشعار ہیں اور صرف دو ہفتہ میں تمام ہوئی

۸۔ شیریں خسرو (مثنوی) — مشہور مثنوی ہے اور ۶۹۸ھ میں ختم ہوئی ۴۱۲۴ اشعار ہیں

۹۔ آئینہ اسکندری (مثنوی) — سکندر نامہ کا جواب ہے ۴۴۵۰ اشعار ہیں ۶۹۹ھ میں تمام ہوئی

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۸ پر ملاحظہ ہو)

بے نظیر فیاضیوں نے بہت جلد تمام لوگوں کو اس کا طرفدار بنا دیا۔ اُن امراء میں سے جنھوں نے علاء الدین کی توجہ اپنی طرف جذب کی

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۷)

۱۰ — لیلےٰ مجنوں (مثنوی) ۶۹۸ھ میں ختم ہوئی ۲۶۶۰ اشعار ہیں

۱۱ — ہشت بہشت (مثنوی) نظامی کی ہفت پیکر کا جواب ہے ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی ۳۲۸۲ اشعار ہیں

۱۲ — تاج الفتوح سلطان جلال الدین کی تخت نشینی کے سال اول یعنی ۶۸۹ھ سے ۶۹۰ھ تک کے حالات درج ہیں۔

۱۳ — نہ سپہر تطب الدین خلجی کے نام سے منسوب ہے

۱۴ — عشقیہ خضر خاں (علاء الدین کا بیٹا) اور دیول رانی (والی گجرات کی لڑکی) کی داستان عشق و محبت ہے پہلے ۴۲۰۰ اشعار لکھ کر اس کو ختم کر دیا تھا لیکن جب خضر خاں مارا گیا تو ۱۳۱۹ اشعار دیول رانی کے حال میں اور اضافہ کئے اور اس طرح ۷۱۵ھ میں یہ مثنوی تمام ہوئی

عشقیہ دول رانی خضر خاں

۱۵ — اعجاز خسروی تین جلدوں میں ہیں۔ اس میں نثر نویسی کے اُصول منضبط کئے اور سیکڑوں صنائع اختراع کئے ۷۱۹ھ میں تمام ہوئی

۱۶ — تغلق نامہ غیاث الدین تغلق کے حالات و فتوحات اس میں درج ہیں

۱۷ — خزائن الفتوح و تاریخ علائی اس میں سلطان علاء الدین کے حالات درج ہیں

۱۸ — افضل الفوائد ملفوظات ہیں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے

۱۹ — مناقب ہند تاریخ دہلی ان کتابوں کا ذکر دولت شاہ نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے

ان میں سے اکثر کتابیں ایسی ہیں جو ایک مورخ کے لئے فراہمی مواد میں بہت مدد دیتی ہیں اور دنیائے شاعری میں صرف امیر خسرو ہی کی وہ ذات جن کے لٹریری کارنامے تاریخی نقطۂ نظر سے بھی اتنی اہمیت رکھتے ہوں۔ (ماخوذ از تذکرۂ دولت شاہ، فرشتہ، بدایونی، بیان خسرو وغیرہ)

۵ — تاریخ فرشتہ نے علاء الدین کے دہلی پہونچنے کا زمانہ آخر ۶۹۶ھ لکھا ہے لیکن صاحب طبقات اکبری اور ضیاء برنی نے ۶۹۵ھ ظاہر کیا ہے حضرت امیر خسرو نے اپنی تاریخ علائی میں تو تاریخ بھی (۲۲ ذی الحجہ ۶۹۵ھ) متعین کر دی ہے۔ چونکہ حضرت امیر خسرو، خاندان خلجی اور اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ عہد علائی کے مورخ و شاہد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس لئے انھیں کا بیان زیادہ مستند ہو سکتا ہے۔ اور اسی کو عام طور سے محققین تاریخ نے صحیح تسلیم کیا ہے۔

۶ — تاریخ وصاف کا اصلی نام "تزجیۃ الامصار و تجریۃ الآثار ہے" اس کا مصنف عبداللہ ابن فضل اللہ شیرازی ہے، جو وصاف کے نام سے شہرت رکھتا ہے اور اسی لئے یہ کتاب تاریخ وصاف کے نام سے تعبیر کی جاتی ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۹ پر ملاحظہ ہو)

ضیاء برنی کے چچا اور باپ بھی تھے

برنی کا چچا ملک علاؤالملک کو ولایت کڑہ سپرد کی گئی اور اس کے باپ مویدالملک کو قصبۂ برن (بلند شہر کی) نیابت و خواجگی مرحمت ہوئی[1]

سلطان علاؤالدین اس میں کلام نہیں کہ بے انتہا سخت اور ظالم ہونے کی حد تک سخت گیر تھا۔ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ایک بے مثل سپاہی اور بڑے زبردست عزم کا بادشاہ تھا

جس وقت علاؤالدین کو معلوم ہوا کہ قتلغ خواجہ[2] پسر دواخاں (ماوراءالنہر کا بادشاہ) دو لاکھ مغلوں کے جمعیت سے دریائے سندھ کو عبور کر چکا ہے اور اب تسخیر دہلی کے لئے چلا آرہا ہے تو وہ بہت متردد ہوا کیونکہ فتنۂ مغل سے خائف ہو کر ہزاروں آدمی قرب وجوار کے بھاگ بھاگ کر روزانہ دہلی میں پہونچ رہے تھے۔ گلیوں، بازاروں، مسجدوں اور محلات میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو ان پناہ گزینوں سے نہ بھر گئی ہو، غلہ اور تمام اشیاء سخت گراں ہو گئی تھیں چنانچہ علاؤالدین نے امراء کو جمع کر کے سب کی رائے طلب کی۔ چونکہ دہلی کی حالت اس وقت ایسی نہ تھی کہ مغلوں کی مدافعت آسانی سے ہو سکتی۔ اس لئے اکثر امراء نے یہی رائے دی کہ جہاں تک ممکن ہو صلح و آشتی سے کام لیکر اس فتنہ کو دفع کر دینا چاہیئے۔ علاؤالدین نے یہ سنکر کہا کہ:-

"جو کچھ آپ نے کہا ہے وہ صحیح ہے لیکن یہ بتایئے کہ میں دنیا کو اپنی صورت کیونکر دکھا سکوں گا۔ کیا منہ لیکر گھر میں جاؤنگا اور میں کیا سلطنت کروں گا نتیجہ جو کچھ ہو میں ان مغلوں سے جنگ کروں گا"

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۸)

شعبان ۶۹۹ھ میں یہ کتاب ختم ہوئی اور اسی وقت پہلی چار جلدیں شائع بھی ہو گئیں کیونکہ رشید الدین نے اپنی مشہور کتاب جامع التواریخ میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ اسکے بعد مصنف نے ایک جلد اور لکھی اور ۷۰۸ھ تک کے واقعات اس میں درج کئے۔

اس تاریخ میں اُس عہد سے ترتیب واقعات کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس عہد میں تاریخ جہاں کشا کی ترتیب ختم ہوئی یعنی منگوخاں کے انتقال اور قبلائی خاں کی تخت نشینی سے اس کتاب کی ابتداء ہوتی ہے

یہ کتاب مغلوں کے نہایت معتبر تاریخ سمجھی جاتی ہے اور یورپ کے اکثر مصنفین نے اس کتاب سے بہت مدد لیا ہے

تیسری اور چوتھی جلد میں اسنے ہندوستان کے کچھ حالات درج کئے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس نے بہت کاوش سے کام لیا ہے

[1] طبقات اکبری ۶۸ - فیروز شاہی (الیٹ) - ۳ - ۱۶۱

[2] فرشتہ اور بدایونی نے پسر داؤد درج ہے لیکن صحیح دُوا یا تو ا معلوم ہوتا ہے کیونکہ چغتائی سلسلہ میں اسکا نام ایک شخص تھا جو قبلائی کا مشہور دشمن تھا۔ یہ ۱۳۰۶ء میں مرا اور کئی لڑکے اپنے بعد چھوڑے جن کا ذکر مغلوں کی تاریخ میں پایا جاتا ہے

چنانچہ اس نے شہر کا مناسب انتظام کرکے فوج جمع کی اور میدان کیلی میں مغلوں سے ایسا مردانہ مقابلہ کیا کہ تاریخ میں اس کی دوسری نظیر مشکل سے مل سکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کو سخت شکست ہوئی اور علاؤالدین تاجِ فتح مندی سر پر رکھے ہوئے دلی واپس آیا۔ اور اپنے نام کے خطبہ میں اور سکون میں سکندر ثانی کا لقب اضافہ کیا۔[1]

سلطان علاؤالدین، باوجود ایک جابر و خود سر بادشاہ ہونے کے، ہمیشہ تمام امور میں اپنے امراء سے مشورہ طلب کرتا تھا اور ایک صائب رائے کے مقابلہ میں اپنے بڑے سے بڑے ارادہ کو ترک کر دیتا تھا

جب سلطان علاؤالدین تخت نشین ہونے کے بعد دو سال کے اندر تمام خطرات کو دفع کر چکا، مسلسل کامیابیوں اور فتوحات نے اس کے حدود سلطنت کو بہت زیادہ وسیع کر دیا اور گجرات وغیرہ پر قابض ہو کر تمام امور سلطنت اس کی مرضی کے مطابق طے ہو گئے تو اس کو اپنی عظمت و جبروت کا ایک سخت پندار پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس نے ایک دن سوچا کہ جس طرح نبی آخر الزماں نے اپنے چار اصحاب کی مدد سے ایک دین و شریعت کو رواج دیا اسی طرح اگر میں بھی اپنے چار یار (الماس بیگ الغ خاں، ملک نصرت خاں، ملک ظفر خاں، ملک نصرت خاں، سنجر الپ خاں) کی مدد سے کوئی شریعت قایم کروں تو میرا نام قیامت تک قایم رہے گا۔ اسی کے ساتھ دوسرا خیال اس نے یہ قایم کیا کہ جس طرح سکندر رومی نے کشور کشائی اور ملک گیری میں شہرت حاصل کی، اسی طرح میں بھی خراسان و ماوراء النہر وغیرہ پر قبضہ کرکے تمام عراق و فارس، عجم و شام، فرنگستان و حبش وغیرہ کو مفتوح کروں اور اپنی شریعت کو رواج دوں

جب وہ نشہ کی حالت میں ہوتا تو اکثر اس مسئلہ پر بحث کرتا اور اس کے امراء و ندیم خوف کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکتے ایکدن علاء الملک کوتوال کے سامنے بھی یہی ذکر ہوا اس نے حد درجہ جرأت سے کام لیکر علاءالدین کو سمجھایا کہ منصب نبوت خدا کی طرف سے عطا ہوتا ہے اور چونکہ اب سلسلہ نبوت ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے اس لئے یہ خیال قایم کرنا سخت نادانی اور خلافِ انصاف ہے۔ رہا سکندر کی طرح عزم جہاں کشائی کرنا، سو اس کے لئے دیکھ لیجئے کہ آپ کے پاس کوئی وزیر ارسطاطالیس کی طرح ہے جو آپ کی غیبت میں انتظام سلطنت کو درہم و برہم نہ ہونے دے۔" یہ سنکر علاؤالدین نے کہا کہ پھر اب میں کیا کروں، یہ تمام خزائن و دفائن کس کام میں لائے جائیں۔ علاؤالملک نے کہا کہ ابھی تو ہندوستان کا سارا جنوبی حصہ تسخیر کے لئے پڑا ہوا ہے، رنتھنبور، چندیری، چتور، مالوہ، دھار، اجین فتح کیجئے علاوہ اس کے حدود کابل کا مستحکم کرنا ضروری ہے تاکہ مغلوں کی طرف سے اطمینان کلی حاصل ہو جائے۔"

سلطان علاء الدین نے یہ سنکر اپنے خیال سے توبہ کی اور اسی وقت علاء الملک کو دس ہزار تنکہ دو آراستہ گھوڑے نہایت قیمتی زریں خلعت۔ طلائی کمربند جو وزن میں نصف من تھا، اور دو گاؤں انعام میں دئے[2]

---

[1] فیروز شاہی (الیٹ) ۳۔ ۲۶۶، بدایونی ۷۴، فرشتہ ۱۰۳-۱۰۴، طبقات اکبری ۷۰، ٹڈیول انڈیا ۹۶-۹۷ [2] فیروز شاہی (الیٹ) ۳-۱۷۰-۱۷۱

سلطان علاؤالدین راست پسندی کے ساتھ اُصولِ سیاست سے بھی کما حقہ واقف تھا اور نظم و نسق قائم رکھنے کے لئے وہ اپنے تمام ذرائع صرف کر دیا کرتا تھا۔ جب وہ قلعۂ رنتھبور کی تسخیر کے لئے آمادہ ہوا اور وہاں توقع سے زیادہ اس کو دیر لگی تو دہلی میں مسلسل تین چار سازشیں اس کے خلاف ہوئیں۔ سب سے پہلے سلیمان شاہ اکت خاں (برادر زادہ علاؤالدین) نے سازش کی اور اپنے نزدیک سلطان علاؤالدین کو ہلاک کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ اسکے بعد عمر و خاں اور منگو خاں (علاؤالدین کے ہمشیر زادگان) نے سلطان کی غیبت سے ناجائز فایدہ اُٹھا کر علمِ بغاوت بلند کیا، لیکن یہ بھی گرفتار ہو کر اپنی سزا کو پہونچے۔ پھر آخر میں حاجی نامی ایک شخص نے زیادہ سنگین بغاوت کی۔ یہ امیر الامراء فخرالدین کوتوال سابق کا غلام تھا اس نے دہلی کو خالی پاکر ہنگامہ مچا دیا، جو مشکل سے فرو ہو سکا۔ گجرات کے نومسلموں کی بغاوت اس سے قبل ظاہر ہو چکی تھی۔ الغرض سلطان علاؤالدین متردد ہوا اور بغاوتوں کے اس سلسلہ کو ختم کر دینے کے لئے اس نے امراء کو جمع کر کے مشورہ طلب کیا۔ ان میں بعض نے کہا کہ بدامنی کے چار اسباب ہوا کرتے ہیں:۔

۱۔ خلق کے نیک و بد سے بادشاہ کا لاعلم رہنا

۲۔ شراب کا علانیہ استعمال کیونکہ نشہ کی حالت میں لوگ مافی الضمیر کو آزادی کے ساتھ ظاہر کر دیتے ہیں اور اس طرح باہم دگر فتنہ و فساد پر لوگوں میں اتفاق ہو جاتا ہے

۳۔ امراء و اعیان کا ایک دوسرے سے تعلق رشتہ داری اور خلوص و محبت کا بڑھ جانا کہ ایک پر اگر آفت آتی ہے تو سب اس کی مدد کرتے ہیں

۴۔ زر و مال کی کثرت کہ جب بد اصل آدمی دولت مند ہو جاتے ہیں تو ہمیشہ ان میں خیالات فاسد ہی پیدا ہوتے ہیں

علاءالدین یہ سنکر متنبہ ہوا اور سب سے پہلے اس نے اپنی بیخبری دور کرنے کے لئے تمام ملک میں جاسوس مقرر کئے اور خبر رسانی کا ایک ایسا مکمل انتظام کیا کہ امراء وغیرہ جو باتیں رات کو اپنے گھر کے اندر کرتے تھے۔ وہ صبح کے وقت بادشاہ کو معلوم ہو جاتی تھیں اور جب امیر آتا تو بادشاہ ایک پرچہ پر لکھ کر اس کو دکھا دیتا کہ رات کو تم نے یہ یہ باتیں کی ہیں۔ رفتہ رفتہ لوگ اس قدر خایف ہو گئے کہ خلوت و جلوت میں گفتگو کرنا دشوار ہو گیا۔ اور سازش و سرگوشی کا بالکل سدباب ہو گیا۔ اسی کے ساتھ اس نے اپنے ملک کے تمام راستوں کو اس قدر محفوظ کر دیا کہ تمام قافلے آزادی کے ساتھ سفر کرتے تھے اور رات کو اپنا اسباب بغیر کسی حفاظت کے یونہی کھلا چھوڑ دیتے تھے، پھر یہ انتظام صرف دہلی ہی کے قرب و جوار میں نہ تھا بلکہ کابل و کشمیر سے لیکر بنگال تک، سندھ و گجرات سے لیکر تلنگانہ و معبر تک ہر جگہ راستوں کے پرامن ہونے کی یہی کیفیت تھی اور رہزنی و قزاقی بالکل مفقود ہو گئی تھی اگر کوئی سیاح یا مسافر گاؤں میں پہونچتا تو مقدم اور اُس گاؤں کے لوگ، اس کو عزت کے ساتھ ٹھہراتے اور کھانے پینے کا بندوبست کرتے

دوسرا انتظام شراب خواری کا تھا۔ ہر چند یہ ذرا مشکل کام تھا کیونکہ علاؤالدین خود اس کا عادی تھا ــــــ

لیکن اس نے اپنی طبیعت پر سخت جبر کیا اور سب سے پہلے اپنے آبدارخانہ کو درہم و برہم کیا۔ جس قدر چینی کے برتن تھے ان کو تڑوا دیا اور طلائی و نقرئی ظروف کو گلوا کر دارالضرب میں بھیجدیا اور تمام ملک میں اعلان کر دیا کہ بادشاہ نے شراب سے توبہ کرلی ہے اس لئے اب اگر کوئی شراب بنائے گا یا پیئے گا تو قتل کر دیا جائے گا

معاملات اور اجناس کی مہانگی

مورخین کا بیان ہے کہ اس فرمان کے بعد اس قدر شراب کے قرابے لوگوں نے اپنے گھروں سے نکال نکال کر لنڈھائے کہ تمام راستوں میں کیچڑ ہوگئی۔ الغرض جب وہ اس انتظام سے بھی فارغ ہوا۔ تو امراء و اعیان کے لئے ایک فرمان جاری کیا کہ آیندہ سے بلاحکم سلطانی آپس میں نہ کوئی رشتہ قایم کریں نہ ایک دوسرے کی دعوت کریں۔ اس سے تمام امراء کا ایک دوسرے سے ملنا جلنا اور آپس میں تعلقات رشتہ داری پیدا کرنا مسدود ہوگیا

چوتھے سبب کا اس نے یہ انتظام کیا کہ سوائے مخصوص امراء و اعیان کے اور لوگوں کے پاس جتنے گاؤں، وقف، انعام، جاگیر یا منصب کی صورت میں پائے جاتے تھے، سب کو ضبط کر کے خالصہ کرلیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب پر معاش تنگ ہوگئی اور فتنہ و فساد کا خیال دور ہوگیا

مالگذاری کے اصول

اس انتظام سے فارغ ہونے کے بعد وہ دیہات کی طرف متوجہ ہوا۔ اسوقت تک انتظام کی صورت یہ تھی کہ مقدم اور چودھری سے وصولی مالگذاری کا معاملہ ہوا کرتا تھا اور یہ لوگ رعایا کو سخت تباہ کر رہے تھے چنانچہ سلطان نے پیمایش زمین کے مطابق مالگذاری فی بسوہ مقرر کی اور حکم دیا کہ نصف پیداوار بلا کسی استثناء و کمی کے سب سے وصول کرلی جائے۔ علاوہ اس کے مقدموں سے جو وصول ہو وہ خزانہ میں داخل کیا جائے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حکم دیا کہ کوئی شخص خواہ مقدم ہو یا معمولی کاشتکار۔ چار ہل، دو بھینس، دو گائے اور بارہ بکریوں یا بھیڑوں سے زیادہ نہیں رکھ سکتا۔ پھر چرائی بھی مقرر کی اور آباد گھروں کا کرایہ بھی معین کیا۔ اگر کوئی محرر یا عامل بددیانتی کرتا یا ان احکام کی پوری پابندی نہ کرتا تو اس کو سخت سزا دیجاتی اور اگر سوائے چارہ کے وہ کوئی اور چیز گانوں سے حاصل کرتا تو پٹواری کے کاغذات سے دیکھکر اسکی قیمت وصول کرلی جاتی۔

اس سختی کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاین عمال و محرر ملازمت سے بیزار ہوکر نوکریاں ترک کرنے لگے اور تمام مقدم و چودھری جو معزز و امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے بالکل محتاج ہوگئے اور ان کی عورتیں محنت و مزدوری کرنے لگیں

مغلوں کا حملہ اور انکی ناکامی کے اسباب

یہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ علاؤالدین ایک بار میدان کیلی میں مغلوں کو شکست دے چکا تھا لیکن وہ ان کے فتنہ کی طرف سے بالکل مطمئن نہ تھا اور نہ مغل اپنے حوصلوں کو ترک کر چکے تھے۔ جب انھیں موقع ملتا ہندوستان کی طرف بڑھتے اور دہلی کو فتح کرنے کی تدابیر اختیار کرتے۔ چنانچہ جب علاؤالدین ۷۰۲ھ میں قلعہ چتور کے محاصرہ میں مصروف تھا تو ماوراءالنہر میں یہ خبر پہونچی کہ میدان خالی ہے اور مغل فوجیں دہلی کی طرف بڑھنے لگیں۔ علاؤالدین قلعۂ چتور فتح کرنے کے بعد مجبوراً پھر دہلی واپس آیا لیکن چونکہ شاہی افواج کا ایک بڑا حصہ ورنگل کی طرف فتوحات میں مصروف تھا اس لئے یہ بہت

متردد ہوا کہ کیا کرے۔ تاہم اس نے خاربندی اور خندقوں سے دہلی کو محفوظ کیا اور اپنی افواج فتنہ کو فراہم کرنا چاہا اتفاق سے دو ماہ محاصرہ کرنے کے بعد مغلوں میں از خود خوف و ہراس پیدا ہو گیا اور وہ واپس چلے گئے۔ اس کے بعد علاؤالدین نے مستقلاً ایسے ذرائع اختیار کرنے چاہے جن سے آیندہ کے لئے بھی مغلوں کی طرف سے اطمینان ہو جائے۔ اس کے لئے اسنے حصار دہلی کو از سر نو تعمیر کرایا۔ قصر ہزار ستون اور دوسری عمارات طیار کیں لیکن صرف حصار و عمارات بیکار تھیں اس لئے اسنے یہ بھی چاہا کہ عساکر سلطانی کی مقدار و تعداد زیادہ کر دی جائے اور یہ اس وقت ممکن تھا جب تنخواہیں کم کر دی جائیں ورنہ یوں تو موجودہ خزانہ صرف ۶ سال کے مصارف کے لئے کافی ہو سکتا تھا۔ امراء سے مشورہ کیا تو انھوں نے کہا کہ لشکریوں کی تنخواہ اسوقت کم ہو سکتی ہے جب تمام اشیاء ارزاں ہو جائیں چنانچہ اس کے لئے علاؤالدین نے چند قواعد مقرر کئے اس کا اثر یہ ہوا کہ غلہ کپڑا وغیرہ بہت ارزاں ہو گیا اور باوجود اس کے کہ پھر قحط بھی رونما ہوا لیکن ارزانی بدستور باقی رہی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قواعد سلطان علاؤالدین کی خصوصیاتِ حکومت میں داخل ہیں جس کی طرف اس سے قبل کسی کو توجہ نہیں ہوئی اور نہ اس قدر ارزانی اس سے پہلے کبھی دیکھی گئی۔ پھر لطف یہ کہ یہ ارزانی عارضی نہ تھی بلکہ علاؤالدین کے بقیہ ایام حکمرانی تک بدستور باقی رہی۔ اور اس میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا۔ وہ ضوابط و قواعد مجملاً یہاں بیان کئے جاتے ہیں۔

۱۔ اہلِ بازار کو نرخ مقرر کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ صرف بادشاہ نرخ مقرر کرے گا۔ چنانچہ تمام مملکت میں حسب تفصیل ذیل نرخ مقرر کیا گیا:۔

ایک من گیہوں	۷½ جیتل	ایک سیر شکر تری	۱½ جیتل[1]
" جو	۴ "	" شکر سُرخ (گڑ)	¼ "
" چاول	۵ "	۲½ سیر گھی، مکھن	۱ "
" ماش	۵ "	۳ سیر روغن کنجد	۱ "
" چنا	۵ "	۲½ من نمک	۵ "
" موٹھ	۲ "		

۲۔ ملک قبول الغ خاں (جو انتظامی معاملات میں نہایت صحیح فراست رکھتا تھا) منڈی کا داروغہ یا شحنہ مقرر کیا گیا جس کا کام صرف یہ تھا کہ مقررہ نرخ میں کوئی تفاوت نہ ہونے دے

---

[1] عہدِ علائی کا من موجودہ وزن کے لحاظ سے ۱۲½ سیر کا تھا۔ ایک سیر موجودہ ۶ چھٹانک کے برابر اور ایک جیتل تقریباً دو پیسہ یا ایک اور دھنے کی قیمت کا۔ اس لئے اگر حساب لگایا جائے، تو معلوم ہو سکتا ہے کہ موجودہ ارزانی اور سکوں کے لحاظ سے عہدِ علائی میں ایک من (یعنی موجودہ ۴۰ سیر) گیہوں کی قیمت ۱۲ر (۱۲¾ سکۂ انگریزی) تھی

۳ - دوآب کے تمام خالصہ دیہات کی مالگذاری غلہ کی صورت میں وصول کی جائے اور سلطنت کی طرف سے غلہ کے انبار محفوظ رہیں اگر بازار کا غلہ کم ہو جائے تو شاہی غلہ کو بازار کے نرخ سے فروخت کریں

۴ - سلطنت کے تمام سفری غلہ فروشوں (بنجاروں) کو طلب کر کے ساحل جمن پر آباد کیا جائے اور اُن سے معاہدہ لیا جائے کہ باہر سے غلہ منگا کر شہر میں مقررہ نرخ سے فروخت کریں گے

۵ - غلہ جمع کرنے کی سخت ممانعت کر دی گئی - اگر کوئی شخص غلہ جمع کرتا تو بحق سلطنت قرق کر لیا جاتا اور سخت تنبیہ کی جاتی ولایت دوآبہ کے افسران مال سے اقرار نامہ لیا گیا کہ کوئی شخص اُن کے علاقہ میں غلہ جمع نہ کرے

۶ - افسران مال (ریونیو) سے اقرار نامہ لیا گیا کہ وہ کھیتوں ہی پر بنجاروں سے قیمت دلا کر غلہ دیدیں اور سوائے اپنے ضروری خرچ کے غلہ کا ایک دانہ بھی کوئی کاشتکار گھر نہ لیجائے اس سے یہ فایدہ ہوا کہ بنجاروں کو غلہ آسانی سے ملنے لگا، اور بازار میں افراط ہو گئی

۷ - منڈی کے حالات معلوم کرنے کے لئے اس نے تین عہدہ دار مقرر کئے ایک شحنۂ منڈی، دوسرے بریدِ منڈی تیسرے جاسوس منڈی - ان میں سے ہر ایک علٰحدہ علٰحدہ بازار کے حال اور منڈی کے نرخ سے روزانہ بادشاہ کو اطلاع دیتا اگر ان اطلاعوں میں ذرا بھی تفاوت ہوتا تو شحنہ سے سخت باز پرس کی جاتی - اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کوئی شخص مقررہ قواعد سے انحراف کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا اور تمام بازار کا بازار ایک مشین کی طرح چل رہا تھا اور حیرت یہ ہے کہ امساک باراں کے زمانہ میں کبھی غلہ کے نرخ میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا - ایک بار قحط کے زمانہ میں شحنہ نے صرف نصف جیتل (ایک پیسہ) فی من نرخ بڑھا دینے کی درخواست کی تو سلطان نے ۲۱ چوب اس کے ماریں

کوئی شخص ایک وقت میں روزانہ خرچ کے علاوہ نصف من سے زیادہ نہیں خرید سکتا تھا - اگر قحط کی وجہ سے مساکین کا ہجوم زیادہ ہو جاتا اور ان کا کوئی معقول انتظام نہ ہوتا تو شحنہ کو سخت سزا دیجاتی - شہر کا ہر محلہ ایک بنجارے کے سپرد تھا اور اس کا فرض تھا کہ وہ اس محلہ کے لوگوں کو روزانہ غلہ مہیا کرے

۸ - اسی طرح کپڑے کا نرخ مقرر کیا گیا - اعلیٰ درجہ کا سوتی کپڑا بیس گزفی تنکہ[1] (نقرہ) اوسط درجہ کا سوتی کپڑا تیس گز فی تنکہ (نقرہ) فروخت کرنیکا حکم دیا گیا - اور اسی مناسبت سے اور تمام قسم کے کپڑوں کی قیمت متعین کی گئی - اس کے لئے اس نے ایک مکان سرائے عدل کے نام سے تعمیر کرایا اور حکم دیا کہ یہاں صبح سے لیکر نماز پیشین تک دکانیں کھلی رہیں

۹ - سوداگران شہر و اطراف کے نام دفتریں درج کئے گئے اور ان سے اقرار نامہ لیا گیا کہ اس قدر کپڑا اور اس قسم کا ہر سال

---

[1] فرشتہ نے لکھا ہے کہ تنکہ نقرئی ہو یا طلائی ایک تولہ چاندی یا سونے کا ہوتا تھا ہر نقرئی تنکہ کی قیمتِ تبادلہ پچاس جیتل (ٹامنہ کا پیسہ) ہوتی تھی جیتل کا وزن البتہ مشتبہ ہے بعض کہتے ہیں ایک تولہ تانبہ کا ہوتا تھا بعض پونے دو تولہ کا بتاتے ہیں -

لاکر سرائے عدل میں مقررہ نرخ پر فروخت کیا کریں گے

۱۰۔ ملتانیوں (ملتان کے رہنے والے سوداگروں کو) بیس لاکھ تنکہ (نقرہ) خزانہ شاہی سے دیا گیا کہ اطراف ممالک سے کپڑا خرید کر کے لائیں اور نرخ مقررہ سے بازار میں فروخت کریں

۱۱۔ امراء وغیرہ میں سے جس کو نفیس اور قیمتی کپڑوں کی ضرورت ہو پہلے رئیس بازار کا پروانہ حاصل کرے۔ یہ قید اسلئے لگائی تھی کہ سوداگر یہاں سے نرخ سلطانی پر ارزاں کپڑا خرید کر کے باہر گراں قیمت پر فروخت نہ کر سکیں

۱۲۔ گھوڑوں کی قیمت ۲۰ تنکہ (نقرہ) سے بارہ تنکہ (نقرہ) تک مقرر کی گئی۔ اور حکم دیا گیا کہ صرف بازار ہی میں نرخ مقررہ کے مطابق گھوڑوں کی خرید و فروخت ہو

۱۳۔ لونڈی غلاموں کی قیمت ۲۰۰ تنکہ (نقرہ) سے ۵ تنکہ نقرہ تک مقرر کی گئی

الغرض اس نے، گائے، بھینس، بکری اور بازار کی تمام چیزوں یعنی ٹوپی سے موزہ تک، شانہ سے سوزن تک، نیشکر سے سبزی تک، ہر قسم سے شوربہ تک، حلوائے صابونی سے ریوڑی تک، بریانی سے روٹی تک، پان پھول سے ساگ پات تک، الغرض تمام ضروری اشیاء حتےٰ کہ ایک ندیم خاص کے کہنے پر شاہدان بازاری تک کا نرخ مقرر کر دیا۔ چنانچہ فرشتہ نے لکھا ہے کہ:۔

"عہد علائی میں مقری بحساب فی سیر دو جیتل[1]۔ شکر تری فی سیر ایک جیتل۔ شکر سرخ فی سیر نصف جیتل۔ ٹنکہ ۵ سیر فی جیتل فروخت ہوتا تھا"

۱۴۔ بادشاہ صرف شحنہ وغیرہ کی اطلاع پر کفایت نہ کرتا بلکہ کمسن لڑکوں کو جنھیں کوئی وقوف نہ ہوتا دام دے کر بازار بھیجتا اور پھر ان چیزوں کو وزن کراتا۔ اگر وزن یا قیمت میں خلاف قاعدہ کوئی فرق ہوتا تو سخت سزا دی جاتی اور کمترین سزا یہ تھی کہ ناک کان کاٹ لئے جاتے یا جس قدر کم اس نے دیا ہے اتنا ہی گوشت اس کی ران یا کوہنے سے کاٹ کر اس کے سامنے ڈال دیا جاتا

الغرض علاؤالدین نے مستحکم اور عجیب و غریب انتظام بازار کا کیا کہ اس کی حالت میں پھر کوئی تغیر نہیں ہوا اور کبھی کسی نے قانون مقررہ کی خلاف ورزی نہیں کی۔

۱۵۔ جب علاؤالدین بازار کا سارا انتظام کر چکا تو اس نے سپاہیوں کی تنخواہیں حسب ذیل مقرر کیں:۔

سپاہی درجہ اول — دو سو چونتیس تنکہ (تقریباً ۲۴ پونڈ طلائی موجودہ انگریزی سکہ کے مطابق) ماہوار

سپاہی درجہ دوم — ۱۵۶ تنکہ ماہوار

سپاہی درجہ سوم — ۸۷ تنکہ ماہوار

[1] حسب بیان فرشتہ اس وقت سیر، وزن میں ۲۴ تولہ کا ہوتا تھا

جس کے پاس دو گھوڑے ہوتے اس کو ۸۷ تنکہ اور زیادہ ملتا

عارضِ ممالک کی خدمت

۱۶ - عارضِ ممالک (جسے موجودہ اصطلاح انگریزی میں MASTERMASTER کہہ سکتے ہیں) تمام سپاہ کا معائنہ کرتا اور جو فنِ تیر اندازی و شمشیر زنی وغیرہ کا ماہر ثابت ہوتا اسے گھوڑے کی قیمت دیدی جاتی اور گھوڑا داغ دیا جاتا

جب علاؤالدین ان تمام انتظامات سے فارغ ہوگیا اور اس نے فوج کا جایزہ لیا تو معلوم ہوا کہ صرف سواروں کی تعداد چار لاکھ بہتّر ہزار ہے

عہد علاؤالدین کی فوج کی تعداد

اسی عسکری انتظام کا نتیجہ تھا کہ اس کے بعد جب مغلوں نے عہد علائی میں ہندوستان کا قصد کیا تو ہمیشہ انکو شکست ہوئی اور نہایت کثیر تعداد میں مقتول و مقید ہوئے

علاؤالدین پہلے بالکل ناخواندہ شخص تھا اور بعد کو اس نے صرف معمولی نوشت و خواند سیکھ لی تھی۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ جتنے ماہرانِ فن، بزرگان دین، علماء کرام، شعراء عظام، اس کے زمانہ میں ہوئے ہیں کسی عہد کو نصیب نہیں ہوئے۔

حضرت شیخ الاسلام شیخ نظام الدین اولیاؒ، شیخ علاؤالدین صابر برہیرہ شیخ فریدالدین گنج شکر، قطب الاولیا شیخ رکن الدین بن صدرالدین عارف ملتانی۔ اسی عہد کے بزرگوں میں سے تھے

علاوہ ان حضرات کے شیخ صدرالدین جو بے مثل فیاض تھے تاج الدین ولد صدرالدین جو اپنی جود و سخاوت علم و حلم کے لحاظ سے بہت مشہور تھے۔ سید مغیث الدین و سید نجیب الدین، قاضی جلال الدین، قاضی صدرالدین، مولانا ضیاءالدین بیانوی حمیدالدین ملتانی جو اپنے کمالات ظاہری و باطنی میں مخصوص درجہ رکھتے تھے اسی بادشاہ کے دربار سے متعلق تھے

علماء ظاہری میں اس وقت ۴۶ صرف وہ لوگ تھے جو درس و تدریس کے مشغلہ میں مصروف تھے۔ فنِ قرأت کے جاننے والوں میں مولانا نشاطی، مولانا علاؤالدین، خواجہ زکی خواہرزادہ شیخ حسن بصری خاص طور سے قابل ذکر ہیں

اہلِ وعظ میں سے مولانا حسام الدین۔ مولوی جلال الدین مولانا شہاب الدین جلیل۔ مولانا کریم وہ نفوس تھے جنھیں نوادر روزگار میں جگہ دی جاتی ہے

طبقۂ شعراء میں صدرالدین عالی، فخرالدین، حمیدالدین، مولانا عارف، عبدالحکیم، شہاب الدین جن میں سے ہر ایک شیوہ شاعری میں ایک خاص طرز کا مالک تھا اور ان سب کے سرتاج حضرۃ امیر خسرو جو جامع کمالات ظاہری و باطنی ہونے کی حیثیت سے دنیا میں فرد تسلیم کئے جاتے ہیں اسی دربار کے زلہ ربا تھے

عہد علاؤالدین کے کاملین فن

اطباء میں صدرالدین، جوینی طبیب، علیم الدین اور مولانا بدرالدین دمشقی خاص لوگ تھے۔ مولانا بدرالدین کی مسیحائی و حذاقت کا یہ عالم تھا کہ اسوقت تک کوئی دوسرا طبیب اس ذہانت و فراست کا پیدا نہیں ہوسکا ان کی نسبت مشہور ہے کہ اگر چند جانوروں کا قارورہ ایک جگہ ملا دیا جاتا تو یہ بتا دیتے کہ فلاں فلاں جانوروں کا بول اس میں شامل ہے

علاوہ انکے دیگر فنون کے ماہرین جن میں مغنی مطرب اہلِ نجوم وغیرہ شامل تھے کثرت سے پائے جاتے تھے اور انکا شمار مشکل تھا۔

باب ۱۰

معلم اکبر کا فیصلہ

ہرچند گزشتہ واقعات نے میرے اندر ایک کیفیتِ اعتماد پیدا کر دی تھی لیکن دفعتاً مجھے خیال آیا کہ معلوم نہیں کہ سوقت میرا زمانۂ قیام یہاں ختم ہو جائے اور بعض کام ادھورے رہ جائیں اس لئے میں نے تمام ان تدابیر پر غور کرنا شروع کیا جو مقصد کی تکمیل کے لئے ضروری تھیں اور جلد سے جلد ان پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا

جسوقت میں اس جامعۃ الجامعات میں داخل ہوا، میرا مقصود صرف یہ تھا کہ یہاں کی ذہنی و روحانی تربیت پوری طرح حاصل کر لوں، اور کرۂ ارض واپس جا کر اس کی اشاعت کروں اور یہ کہنا غالباً ناشکری ہوگی کہ قدرت نے اس کے حصول میں میری مدد نہیں کی۔ کرۂ زمین کی اصلاح کی طرف عملی قدم اُٹھانے کے لئے میں نے جن کی ہمدردی حاصل کی، ان میں خاص خاص یہ تھے:— دلآرام - جام زر - دوست - ماہ کنعان - آزاد پا - آتش بار - شہناز نور — آہنگ زن — اور پسند بنا۔

صرصر کا نام بھی اس فہرست میں نظر آتا اگر اسے اپنے کرۂ مریخ میں واپس جانا ضروری نہ ہوتا۔ اسوقت تک جتنے نفوس کی ہمدردی حاصل ہوئی سب کے سب وہ منتخب تھے۔ لیکن کچھ ذہین و مشہور ہستیاں اور بھی ایسی تھیں جنکی امداد و ہمدردی میں چاہتا تھا

مجھے لڑکپن سے تھیٹر کی طرف میلان تھا، میں خود بھی کبھی کبھی ڈرامے لکھتا تھا، ڈراموں کے جلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ میں یہاں آیا، تو اپنا یہ شوق بھی ساتھ لایا اور آسمانی تمثیل نگاروں اور اداکاروں سے کافی مراسم پیدا ہو گئے۔ انھیں میں ایک بازدل تھا جو سیارہ الطایر سے یہاں آیا تھا یہ بڑا زبردست اداکار، بڑا قابل تمثیل نگار تھا۔ یہ رفتہ رفتہ مجھ سے بہت مانوس ہو گیا۔ میں نے اس سے بھی درخواست کی کہ وہ مصلحین کرۂ ارض کی فہرست میں اپنا نام درج کرالے، لیکن اس نے مجھے ایک ناتجربہ کار نوجوان سمجھ کر خاص توجہ نہیں کی

جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا، مجھے کرۂ ارض میں تھیٹر سے بہت دلچسپی تھی، لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ میرا اسی کا ہو رہا تھا۔ فطرتاً میں بہت تنوع پسند واقع ہوا ہوں اور زندگی کا ہر شعبہ میرے لئے خاص کشش رکھتا ہے، چنانچہ میں وہاں کلیساؤں میں بھی جاتا تھا، مسجدوں مندروں میں بھی حاضری دیتا تھا، راہبوں، پنڈتوں اور ملاؤں سے بھی ملتا تھا —

علاوہ ان کے میں نے مشہور تاریخی مقامات کا بھی سفر کیا، مشہور مشہور جگہوں کا جا ترا کیا۔ جوگیوں، فقیروں اور سادھوؤں سے ملا، حکام و عمال سے ملا، حکماء و فلاسفہ کے پاس گیا اور سب سے نہایت کشادہ دلی سے باتیں کیں، لیکن میرا دل جوں کا توں خالی رہا

ماہرین سائنس نے یقین دلایا کہ دنیا میں جو کچھ ہے وہ صرف جوہر فرد کی طاقت کا نتیجہ ہے، فقیروں نے کہا، جب تک ترک دنیا نہ کی جائے روحانی ترقی محال ہے، مندر والوں نے اپنے ناقوس کے پوتر ہونے کی کتھا سنائی، مسجد والوں نے اپنی اذان کی پاکیزگی کا وعظ کہا، اہل کلیسا نے آسمانی بادشاہت کے مواعید بتائے، لیکن وہ چیز جس کے لئے میرا دل بیتاب تھا کہیں نہ ملی۔ اور اسی لئے گھبرا کر میں آسمانی جامعۃ الجامعات میں چلا آیا

یہاں پہونچکر علاوہ اُن روحوں کے جن کا میں نے ابھی ذکر کیا، کچھ اور فن کار روحیں بھی مجھ سے مالوف ہوگئی تھیں ان میں ایک ارانوس کا نقاش جہاں نما تھا، دوسرا نیچون کا بت ساز تصویر کش تھا، تیسرا النطارس کا ماہر جمالیات روح افزا تھا۔ اسی طرح ارقطورس کا حکیم صحت دہ، کانوئیس کا پہلوان زور افشاں، ویگا کا مدبر دربار عدلی اور کیپیلا کا ماہر نفسیات علم پرواز میرے دوست ہوگئے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ یہ سب میرے معاون ہوکر کرۂ ارض کی اصلاح میں حصہ لیں۔ چنانچہ ایک دن میں نے معلم اکبر کی روح سے عرض کیا۔ اس نے اول اول تو پس و پیش کیا کیونکہ ان روحوں کی ضرورت خود اُنکے سیاروں کو بھی تھی، لیکن جب میں نے زیادہ اصرار سے کام لیا اور کہا کہ "کرۂ ارض سے زیادہ سقیم حالت کسی کرہ کی نہیں ہے اور سب سے زیادہ توجہ اسی پر صرف ہونا چاہئے" تو اس نے وعدہ کیا کہ وہ ان روحوں کو اس طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرے گا اور جس طرح یہ کوشش کامیاب ہوئی، اس کا حال ذیل کے بیان سے معلوم ہوگا

سیارۂ اعلیٰ کی جمہوریت کا پریسیڈنٹ، فراواں طاہر حال ہی میں منتخب ہوا تھا اور جامعۃ الجامعات کے طلبہ نے اس تقریب میں ایک جلسہ کیا تھا تاکہ فراواں طاہر کے خیالات جمہوریت معلوم کئے جائیں۔ یہ جلسہ نہایت وسیع پیمانہ پر کیا گیا تھا اور بڑا زبردست اجتماع ہونے والا تھا

سب سے پہلے آہنگ زن سے اس جلسہ کی ابتدا ہوئی۔ اس نے سیارۂ اعلیٰ کا ترانہ سنایا جسے سب نے کھڑے ہوکر نہایت خاموشی سے سنا، اس کے بعد آتشبار نے پریسیڈنٹ کے محاسن بیان کئے اور پھر شہناز نور نے مختلف کروں کے مختلف شعراء کی نظمیں سنائیں۔ آخر میں دلآرام اس چبوترہ پر لائی گئی جہاں فراواں طاہر اور افسر شاد بیٹھے ہوئے تھے اور پریسیڈنٹ نے کھڑے ہوکر مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

"خدا خوبصورت ہے اور اس نے انسان کو اپنی ہی شکل کا پیدا کیا ہے، اس لئے سب سے بڑا مذہب وہی ہے جو سب سے زیادہ پرستار جمال ہے۔ اس لئے اے دلآرام میں تجھے "ملکۂ آسمان" کا خطاب پیش کرتا ہوں اور یہ جواہر کا تاج تیرے سر پر رکھتا ہوں"

یہ کہکر وہ آگے بڑھا اور دلآرام کے خوبصورت سر پر ایک سپید تاج ہیروں کا رکھ دیا۔ اسی اثنا میں معلم اکبر کی روح بھی آگئی تھی، لیکن کسی کو اس کا علم نہ تھا۔ جب یہ تمام مراسم ادا ہو گئے تو وہ ظاہر ہوئی اور سب نے اس سے التجا کی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ چنانچہ اسنے ایک ایسی سنجیدگی کے ساتھ جو یکسر تبسم بھی تھی جلسہ سے خطاب کیا کہ:۔

"اے میرے عزیزو، کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ پہلے اپنے اوپر بھروسہ کرنا سیکھو۔ اور اسکی صورت صرف یہ ہے کہ سچائی کو خود اپنے اندر تلاش کرو اور خود اپنی فکر سے کسی نتیجہ پر پہونچو۔ اس آنکھ کے پیچھے جو نظر آرہی ہے ایک اور آنکھ ہے نظر نہ آنے والی۔ اس کان کے پیچھے جسے تم چھو سکتے ہو ایک اور کان ہے محسوس نہ ہونے والا اور تمھارے نفس حساس سے آگے ایک اور نفس ہے اس سے زیادہ حساس، اسلئے میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں کہ تمھارا دیکھنا، سننا اور سوچنا اسی آنکھ، اسی کان اور اسی نفس سے ہونا چاہئے جو ماورائی کیفیت رکھتا ہے۔ اپنی شمع کو ایسی جگہ روشن کرو جہاں ہوا کا اندیشہ نہ ہو۔ دیکھو جب اپنا چراغ تم طاق کے اندر رکھتے ہو، تو وہ کیونکر یکساں روشن رہتا ہے۔ تمھاری شمع کا طاق تمھارا دل ہے، تمھاری روح ہے، جہاں کسی مخالف ہوا کا گزر نہیں۔ اس لئے اسی طرف دھیان رکھو اور اپنی اندرونی قوتوں کو قابو میں رکھو تاکہ تم فطرت کے ساتھ ہم آہنگ رہ کر زندگی بسر کر سکو۔ یاد رکھو کہ اصل چیز یہی ہم آہنگی ہے۔ تمھارا چلنا پھرنا، اُٹھنا بیٹھنا، بولنا چالنا، سونا جاگنا، سب اسی ہم آہنگی کے اندر ہونا چاہئے اور جب ایک بار تمھاری روح میں یہ ہم آہنگی سما گئی تو پھر تم اسوقت بھی مسرور نظر آؤ گے، جب مسرور ہونا دشوار ہوتا ہے اور اس وقت بھی تم متحمل وضابط ثابت ہو گے جب صبر وضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جایا کرتا ہے

اب میں تم سے مستقبل کے متعلق ایک اعلان کرنا چاہتا ہوں۔ میں تمھارے درمیان بہت عرصہ سے ہوں اور مجھے تم سب سے بہت محبت ہو گئی ہے، لیکن اب میری روانگی کا وقت آگیا ہے"

یہ سنتے ہی سب حیران رہ گئے۔ اس کی روانگی کی خبر۔ یہ معلوم ہوا گویا آسمان سے ایک ستارہ ٹوٹا اور غائب ہو گیا۔ سب پریشان ہو گئے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں جانے والا ہے اور کیوں۔ اس نے تھوڑی دیر سکوت اختیار کرنے کے بعد کہا:۔

"اے میرے عزیزو، ایک اور ستارہ کے بسنے والے مجھے بلا رہے ہیں اور میں اپنے شاگردوں کا ایک منتخب قافلہ اپنی مدد کے لئے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں تاکہ میں وہاں پہونچکر ان کو وہی تعلیم دوں جو تم نے حاصل کی ہے"

یہ کہہ کر اس نے مجھے دیکھا، ایک معنی خیز تبسم کے ساتھ میری طرف اس نے اپنی نظر پھیری۔ اسوقت میری کیفیت عجیب تھی۔ میں کچھ سمجھنا چاہتا تھا، لیکن دماغ کام نہ کرتا تھا، میں اس کی نگاہوں کا مدعا جان گیا تھا، لیکن یقین نہ آتا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کیا واقعی دوسرے ستارے سے، میرا کرۂ ارض مراد ہے اور کیا معلم اکبر اب وہاں جانا چاہتا ہے، لیکن مجھے اپنی خوش قسمتی پر اعتبار نہ آتا تھا۔ میں گھبرا گیا، پسینے پسینے ہو گیا اور میرا دل اس طرح دھڑکنے لگا، گویا وہ باہر نکل پڑے گا اور میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امنڈ امنڈ کر آنے لگا۔ معلم اکبر کی آواز پھر بلند ہوئی اس نے کہا:۔

"ہاں، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب کرۂ "کشمکش" جاؤں گا۔ میں نے اپنی ایک جماعت طیار کر لی ہے جو اٹھارہ نفوس پر مشتمل ہے، جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی جماعت اٹھارہ نفوس کی طیار کرے گا اور اسی طرح ہم ایک پورے نوری لشکر کے ساتھ "کرۂ کشمکش" کا سفر کریں گے"

اس وقت مجمع کے تعجب کی کوئی انتہا نہ تھی، ہر شخص کے چہرہ سے عجیب قسم کی حیرانی ٹپک رہی تھی، کیونکہ "کرۂ کشمکش" کا نام بہتوں نے سنا بھی نہ تھا اور جب انھیں معلوم ہوا کہ معلم اکبر کا مستقر اب یہ سیارہ ہوگا تو وہ حیران رہ گئے۔ ایک دوسرے سے پوچھ رہا تھا۔ یہ کرہ کہاں ہے۔ کس قسم کا ہے۔ کن لوگوں کی بستی ہے، اس میں وہ کیا خاص بات ہے کہ معلم اکبر وہاں جانا چاہتا ہے اور وہ اٹھارہ شاگرد کونسے ہیں جن کا انتخاب اس نے کیا ہے

معلم اکبر کی آواز پھر بلند ہوئی۔ اس نے کہا:۔

"سنو، جن کو میں نے منتخب کیا ہے ان میں سب سے پہلا نام "کرۂ کشمکش" کے آوارہ گرد کا ہے"

یہ سنتے ہی سب کی نگاہیں میری طرف پھر گئیں اور میری حالت اس وقت ایسی ہو گئی جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے دفعتاً چونک پڑے اور پھر سو جائے

میرا نام لینے کے بعد اس نے دلآرام۔ جام زر۔ دوستہ پرست۔ حاکم حاکمیاں۔ آزاد پا۔ آتش بار۔ شہناز نور۔ آہنگ زن۔ بازدل۔ جہاں نما۔ تصویر کش۔ پند بنا۔ روحِ افزا۔ صحت دہ۔ زور افشاں۔ دربار عدلی۔ علم پرواز کے سلسلہ وار نام گنائے اور آخر کار اس طرح میرا وہ خواب پورا ہو کر رہا جس کے لئے میں اس قدر بیقرار تھا۔

مکتبہ نگار لکھنؤ

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

مکتبہ نگار لکھنؤ

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح وبسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جسمیں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی۔ نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

قیمت تین روپیہ (۳ر) علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مجموعۂ استفسار وجواب ۳ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۲۳ء سے لیکر ۳۶ء تک کے استفسار وجواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی، مسایل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے۔

قیمت فیجلد تین روپیہ (۳ر) علاوہ محصول

خریداران نگار سے فی جلد ایک روپیہ کم

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے ایسے مشکل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲ر)

خریداران نگار سے تین آنہ (۳ر) کم

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:-

۱ — چند گمشدہ فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

۲ — مادئین کا مذہب۔

۳ — حرکت کے کرشمے۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (۱ر)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴ر) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰ر)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے دو آنہ (۲ر) کم

قراۃ السید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (۱ر)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴ر) کم

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اسکو شروع کر دیتا اخیر تک پڑھ لیتا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنے (۱۲ر)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے تین آنہ (۳ر) کم

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا کے تہذیب شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (۲ر)

علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

کمال طاقت

نوجوانی کمال — جوانمردی کمال — حوصلہ کمال — اُمنگ کمال

KAMAL کمال

رجسٹرڈ REGD.

خون کی افزائش کے لئے دُنیا کی بہترین دَوا ہے۔ رگ و ریشہ مین خون پہنچا کر جوش اور اُمنگ پیدا کرتی۔
اعصاب کو تقویت دے کر اعضا، کو قوی اور مضبوط بناتی،
دل و دماغ کو قوت دیتی، کسل و ماندگی، سُستی و کاہلی کو
دفع کرکے چُستی و چالاکی پیدا کرتی ہے،
غرض کہ جو قوت ایک مرد کو صحیح معنی مین مرد کہلا سکتی ہے
وہ "کمال" ہی کی رہین منت ہے
نشے والی اور زہریلی چیزون سے پاک ہے

قیمت فی شیشی آٹھ روپے

مزید معلومات کیلئے فہرست طلب کیجئے:

TAYYEBI DAWAKHANA UNANI
INDORE BOMBAY

طبّی دَواخانہ یونانی

چوک بازار، اِندور
تار کا پتہ "شاہی" اِندور

۶۶، محمد علی روڈ بمبئی ۳
ٹیلیفون نمبر ۲۶۹۸۳